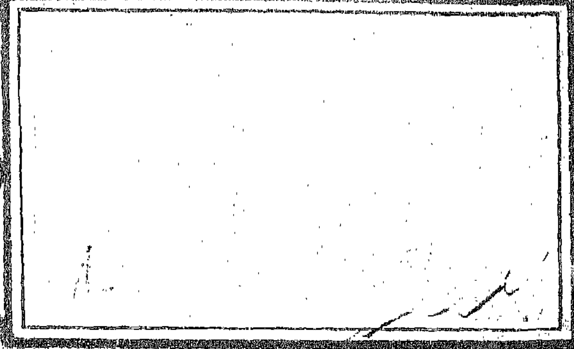
سلسلۂ مطبوعات عصمت نمبر ۱



تصنیف

مغفور جنت مکان حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ

جسے

رازق الخیری ایڈیٹر عصمت و بنات نے

عصمت بک ایجنسی دہلی سے شائع کیا

پہلی مرتبہ

فروری ۱۹۳۴ء

داستانِ پارینہ

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ

کے

چند تاریخی مضامین

جن میں افسانوں سے زیادہ دلچسپی اور دلاویزی ہے اور جن میں غیر مسلم مورخوں کے بعض غیر معقول اعتراضات کا مدلل جواب دیا گیا ہے

فہرست

از علامہ راشد الخیری ؒ



قاتلہ بنت الازور

جب مسلمانوں کا لشکر اسلام کا جھنڈا بلند کرتا ہوا دمشق کے قریب پہنچا، تو قیصر ہرقل شام کے دارالخلافہ انطاکیہ میں تھا۔ خالد جیسے بہادر کو معمولی لٹیرا خیال کیا اور پانچ ہزار فوج کیلوس کی ماتحتی میں مقابلہ پر روانہ کیا۔ ضرار اس وقت خالد کے ساتھ تھے۔ لڑائی ہوئی اور ضرار کی بہادری دیکھ کر دشمن دنگ رہ گئے۔ کیلوس مارا گیا اور مسلمانوں نے دمشق کے باہر ڈیرے ڈال دئے۔

قیصر کو یہ خبر پہنچی تو آگ بگولا ہو گیا۔ ایک لاکھ تجربہ کار سپاہی جو لڑائی میں جانا کھیل اور وطن کی محبت میں جان دینا فخر سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے مقابلے کے واسطے تیار ہوئے۔ اور وردان کی سپہ سالاری میں دمشق چلے۔ مسلمانوں کے خون کی پیاسی تلواریں میانوں سے نکلی پڑتی تھیں۔ دانہ پانی حرام تھا رات دن ایک کر کے مہینوں کی منزلیں دنوں میں طے کیں۔ اور وہ میدان جس کو مسلمان مفتوحہ سمجھے بیٹھے تھے غنیم کے نعروں سے گونج اٹھا۔ دشمن کی جمعیت دیکھ کر مسلمان ششدر رہ گئے۔ خالد نے اپنے لشکر جس کی کل کائنات چالیس ہزار گنتی تھی جمع کیا اور اپنے بھائی ضرار سے کہا کہ بہادری دکھانے کا وقت یہی ہے ہمت نہ ہارو اور خدا کا نام لیکر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ گو لشکر کم ہے مگر خدا کا

وعدہ ہمارے ساتھ ہے۔"

خالد کا اتنا کہنا تھا کہ ضرار شیر کی طرح دھاڑتا ہوا میدان میں آیا اور غنیم کو للکارا۔ بڑا زبردست معرکہ تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں سرزمین دمشق پہ خون کی ندیاں بہنے لگیں۔ ضرار مجروح ہوکر گرفتار ہوئے اور مسلمانوں کی رہی سہی ہمت اور بھی ٹوٹ گئی۔ رافع ابن عمیرہ نے جو ضرار کے ساتھ تھے یہ رنگ دیکھ کر بآواز بلند کہا۔

"مسلمانوں تم ضرار کے واسطے نہیں لڑ رہے تھے جو بد دل ہوتے ہو۔ تم جس کے لئے لڑ رہے ہو وہ تم میں موجود ہے اور تمہارے کام دیکھ رہا ہے وہ زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔"

رافع کی اس گفتگو نے بجھے ہوئے دلوں میں پھر شعلہ بھڑکایا اور مسلمان "اللہ اکبر" کے نعرے لگاتے ہوئے دشمن پر ٹوٹے۔ غنیم نے نہایت جرات سے اس حملہ کو روکا۔ قریب تھا کہ مسلمانوں کا یہ دستہ بالکل برباد ہوجائے کہ شام سر پر آپہونچی اور رات کا تاریک پردہ دونوں کے بیچ میں پڑ گیا۔

ضرار کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی خالد کی آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی۔ صبح ہوتے ہی بہادر دشمن کے گروہ میں گھس گیا۔ اور چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر لگادئے۔ ہر طرف ڈھونڈھا مگر ضرار کا پتہ کہیں نہ چلا۔ خبر دار نے خبر دی کہ ضرار حمص کو بھیجدئے گئے۔ رافع ابن عمیرہ ادھر روانہ ہوئے اور رستہ میں اس فوج سے مٹ بھیڑ ہوئی جو ضرار کو قید کئے لے جارہی تھی۔ مسلمانوں نے اپنے افسر کے لئے جانیں لڑادیں۔ گھمسان کا معرکہ ہوا۔ اور آخر بہادر ضرار کو دشمنوں کے پنجہ سے چھینا اور

دمشق لوٹے۔

ابھی ضرار کو لے کر ربیع کا دستہ واپس نہ آیا تھا کہ خالد نے ہاتھ اُٹھا کر التجا کی کہ "اے معبودِ حقیقی اس وقت بیس ہزار فوج کا مقابلہ ایک لاکھ سے ہے ہماری مدد کر اور ہماری شرم رکھ لے"

اتنا کہا اور بسم اللہ کہہ کر بیس ہزار فوج چاروں طرف سے دشمن پر گری اور آفتاب کے سر پر آنے سے پہلے دمشق میں مسلمانوں کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

دمشق والے بھاگ تو گئے مگر تاک میں تھے کہ کوئی موقعہ لگے تو مسلمانوں سے بدلہ لیں۔ اتفاق یہ ہوا کہ مسلمانوں کا لشکر تو فتح کے نعرے لگاتا ہوا آگے بڑھا۔ عورتیں اور اسباب پیچھے رہ گیا۔ اس سے اچھا موقعہ کیا ہو سکتا تھا۔ پیٹر سولہ ہزار فوج لے کر ان عورتوں پر آ پڑا۔ مال اسباب لوٹ لیا۔ عورتوں کو قید کیا اور درختوں کے سایہ میں تقسیم شروع ہوئی۔ قائلہ ضرار کی بہن اور بہت سا مال پیٹر کے حصہ میں آیا۔

قائلہ بنت الازور علم و فضل کے اعتبار سے اس وقت کی ممتاز عورتوں میں تھی۔ سیرت، صورت، شجاعت، عصمت، غرض قدرت نے تمام خوبیاں اس خاتون میں کوٹ کوٹ کر بھری تھیں۔ تاریخ اسلام اس بی بی پر ناز کر رہی ہے۔ اس کی فصاحت کا نام عرب میں شہرہ تھا۔ تقدیر کی گردش تھی کہ مسلمانوں کی ایسی قابلِ فخر خاتون دشمنوں کے قبضہ میں ہو چکر پیٹر کے حصہ میں آئی۔

قائلہ کو جس وقت یہ خبر ملی کہ مال و اسباب کے ساتھ ہماری بھی تقسیم ہوئی اور میں پیٹر کے حصہ میں آئی تو غصہ کی آگ بھڑک اٹھی۔ ساتھ کی

گرفتار عورتوں سے کہا:-

"ہم عرب کے بہادروں کی بہو بیٹیاں، پیغمبر اسلام صلعم کی اُمت کو اپنے وارثوں سے چھوٹ گئیں اور اس وقت ہمارے پاس کوئی مدد موجود نہیں مگر اس سے پہلے کہ ہم اپنے وارثوں کی امانتوں اور اپنے باپ دادا کی عزت کا خاتمہ کریں بہتر ہے کہ زمین پھٹ جائے اور ہم سما جائیں۔ اے حجاز اور حمص کی عورتوں اُٹھو اپنی عصمت پر قربان ہو جاؤ اور ان دشمنوں کو دکھا دو کہ عرب کی عورتیں عزت کے مقابلہ میں جان کی پروا نہیں کرتیں۔ اگر ان ظالموں میں سے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے بھی دیکھے تو اس کی آنکھیں نکال لو۔

عصمت و عفت کی دیویو! ہم نے اُن ماؤں کا دودھ پیا ہے جو اپنی عزتوں پر مٹ گئیں۔ تمہارے جسم میں اُن بہادروں کا خون دوڑ رہا ہے جن کے سر تن سے اڑ گئے مگر قدم پیچھے نہ سرکے۔ تم اُن دلاوروں کی اولاد ہو جن کا ایک ایک فرد ایک ایک ہزار پر بھاری نکلا۔ زمانہ سینکڑوں ہزاروں برس آگے نکل جائے گا مگر تاریخ اُن کے نام چمکائے گی اور مسلمان اُن کے کارناموں پر فخر کریں گے۔

اے بہادر بیبیو! کیا ہم اس روز کے لئے زندہ رہے تھے کہ جس دن دمشق میں اسلام کا جھنڈا گڑے اُس دن دشمن ہماری تقسیم کریں۔ آؤ سب گلے مل لیں۔ اگر زندہ رہے تو عزت کو ہاتھ سے نہ دیں گے۔ اور مر گئے تو قیامت میں عزت کے ساتھ ملیں گے۔ گو ہم اس وقت نہتے ہیں مگر نہیں یہ بانس کی بلیاں اٹھاؤ اور جو قریب آئے اُس کا مغز پھوڑ دو۔"

قائلہ کی یہ گفتگو ایک چنگاری تھی جو بارود میں جا پڑی اور یہ تمام عرب زادیاں بانس کی بلیاں ہاتھ میں لے کر دائرہ کی شکل میں کھڑی ہوگئیں ایک یونانی

سپاہی کا قریب آنا تھا کہ قائلہ نے بسم اللہ کہہ کر مغز پر ایک ایسا بانس مارا کہ چکرا کر چیختا ہوا گرا۔ غل کی آواز سُنکر تمام لشکر خیموں میں سے باہر نکل پڑا جو قریب آنے کی کوشش کرتا تھا زخمی ہوتا تھا پیٹو نے قائلہ کو بہت سے نشیب و فراز دکھائے مگر پیٹو کا ہر لفظ قائلہ کے کلیجہ پر تیر لگ رہا تھا۔ مجبور پیٹو نے فوج کو حکم دیا کہ ان سب کو تلوار کی باڑ پر رکھ لو۔ اور گردنیں اُڑا اُڑا کر پھینک دو۔ حکم کی دیر تھی فوج نے تلواریں نکال لیں۔ چاہتے تھے کہ تلواروں سے کام لیں کہ خالد اور ضرار دونو بہادر سر پر موجود تھے۔ پیٹو یہ حالت دیکھ کر سہم گیا اور کہنے لگا "عرب کی عورتوں ہم بھی ماں بہنیں رکھتے ہیں اور تمہاری بہادری کی عزت کرتے ہیں" قائلہ کا غصہ کیا فرد ہونے والا تھا پیٹو کے گھوڑے کی ٹانگ پر ایک بانس اس زور سے مارا کہ گھوڑا گر پڑا۔ گھوڑے کا گرنا تھا کہ ضرار نے پیٹو کا کام بھالے سے تمام کر دیا۔ اور اُس کا سر نیزے پر اُٹھا لیا۔

گو قائلہ غفرہ اور اُن کی جماعت آج دُنیا میں موجود نہیں مگر اُن کی شجاعت اور عصمت جب تک تاریخ موجود ہے صفحۂ دُنیا سے مٹنے والی نہیں۔

عصمت نا اُمید

رضیہ سلطانہ

یوں تو ہندوستان کے مسلمان فرمانرواؤں میں سے شاید ہی کوئی خوش نصیب ہو جس کا دورِ حکومت بے داغ نظر آئے مگر جن بے گناہوں پہ تاریخ مروجہ نے دل کھول کر حملے کئے ہیں ان میں سے ایک سلطانہ رضیہ بھی ہے اور ایسے لوگ بہت کم ہوں گے جو اس بیگم کے نام سے آشنا تو ہوں۔ مگر نہ جانتے ہوں کہ ایک حبشی غلام اس کو گھوڑے پر بٹھاتا تھا لیکن سلطانہ رضیہ جیسی مدبر انصاف پسند اور بیدار مغز ملکہ پر ایسا الزام لگانا نہ صرف مورخ کی بددیانتی سمجھی جا سکتی ہے۔ بلکہ ایک ایسا راز ہے جس کی تہ میں تعصب صاف طور پر جھلک رہا ہے۔ زیادہ تر افسوس اس امر کا ہے کہ رضیہ پر اس قسم کا الزام قائم کرنے والے لوگ وہ ہیں جن کا طرز تمدن ایسی باتوں کو مذموم یا معیوب نہیں بلکہ جزو حیات سمجھ رہا ہے اور جہاں علی الاعلان اس سے بدرجہا بڑھے چڑھے تماشے دن رات دکھائی دے رہے ہیں۔ مگر ہم اس سے پہلے کہ سلطانہ رضیہ کے دامن عصمت کو اس گناہ سے پاک ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ اس کی زندگی کی ابتدائی حالات پر نظر ڈالتے ہیں۔

رضیہ بیگم کی ہر دلعزیزی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ

شمس الدین التمش کے بعد جس نے گیارہ بیٹے چھوڑے باوجود رکن الدین کے ولیعہد ہونے کے رعیت نے بالاتفاق سلطانہ کو اپنا حکمران بنانا چاہا اور اپنی جانیں قربان کر کے ایک خونریز معرکہ کے بعد رکن الدین کو قید کیا اور رضیہ بیگم کو ۱۲۳۶ء میں تخت پر بٹھا دیا۔

رضیہ درحقیقت تخت حکومت کی مستحق تھی۔ ایک مسلمان حکمران میں جو صفات ہونی چاہئیں اُس کی ذات میں وہ سب موجود تھیں وہ باپ کے زمانہ حیات ہی میں کار و بار سلطنت پر متوجہ رہتی اور بہت سے مراحل اِس خوبصورتی اور دانشمندی سے طے کر دیتی کہ خود شمس الدین متعجب ہو جاتا۔ اِسی قابلیت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ جب شمس الدین نے گوالیار پر حملہ کیا تھا تو باوجود اُسکے گیارہ لڑکوں کی موجودگی کے اس نے اپنی عدم موجودگی میں رضیہ کو قائم مقام بنایا اور رضیہ سلطانہ نے اِس فرض کو ایسی خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ واپسی پر شمس نے سلطانہ رضیہ کی ولیعہدی کے احکام جاری کر دئیے۔

سلطانہ رضیہ نے سب سے پہلا کام جو حکمران ہونے کے بعد کیا وہ قوانین قطبی و شمسی اور احکام شرعی کی ترویج تھی جس کو عیاش رکن الدین نظر انداز کر چکا تھا۔ مردانہ لباس پہنکر وہ باہر نکلنے لگی۔ تاکہ تمام نظم ونسق سے باخبر رہے۔ اُس کے محل کا دروازہ فریادی کے واسطے ہر وقت کھلا ہوا تھا اور وہ دن ہو یا رات فریاد سننے کے واسطے ہر لمحہ تیار تھی۔ رکن الدین کی گرفتاری اور باقی تمام بھائیوں کی شرارت سے آپس کی خانہ جنگیوں نے رضیہ کو چین نہ لینے دیا۔ یہاں تک کہ لاھور اور ملتان وغیرہ کے حاکم اور وزیر اعظم نظام الملک جنیدی پر بغاوت کا

جادو چل گیا اور یہ لوگ اُس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔ سلطانہ کے واسطے یہ وقت نہایت نازک تھا۔ مگر وہ مطلق نہ گھبرائی اور ایک جرار فوج لے کر مقابلہ پر آئی۔ باغیوں کو قتل کیا حاکموں کو شکست دی، اور جس وقت بھائی عفو تقصیر کے طالب ہوئے تو آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور ان کے قصور معاف کر دیئے۔

اب وہ وقت آیا جس کو مورخ سلطانہ کی شان کے خلاف سمجھ کر اُس پر زبردلانہ حملے کر رہے ہیں۔ یعنی ایک شخص یاقوت حبشی میراخور رضیہ کے مزاج میں اس قدر دخیل ہوا اور اُس کا تقرب اتنا بڑھ گیا کہ جب سلطانہ گھوڑے پر سوار ہوتی تو وہ ہاتھوں سے سہارا دے کر سلطانہ کو سوار کراتا۔

اس موقع پر انصاف کو ہاتھ سے نہ دینے والے غور کر سکتے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کے تھوڑے سے صاحب اختیار ہو جانے پر خوشامدیوں کا کس قدر نرغہ ہو جاتا ہے۔ داشت کرنے کے واسطے تنکا اُٹھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے تو خدام لپک کر اس خدمت کو انجام دیتے ہیں چہ جائیکہ ایک عظیم الشان ملکہ کے دربار میں ایک شخص کو اس قدر رسوخ حاصل ہو جائے کہ امور سلطنت میں بھی اُس سے مشورہ لیا جائے تو وہ اس موقعہ پر خوشامد میں اپنی جان تک نثار کر دیتا تو اُس کے واسطے فخر تھا نہ یہ کہ گھوڑے کی سواری میں رضیہ کو سہارا دینا اُس کے تعلق ناجائز کی ایک شہادت ہو گئی۔

سلطانہ رضیہ باعتبار تدبر اپنے زمانہ کی بہترین حکمران تھی۔ اگر حقیقت نفس الامر یہ ہوتی تو وہ ضرور رعیت کے مشتبہ ہو جانے کی احتیاط کرتی۔ مگر وہ بالکل آزاد منش عورت تھی پرواہ مطلق نہ کی۔ کھلم کھلا پھرتی اور میدان

کارزار میں وردی پہنکر شریک ہوتی۔

افسوس یہ ہے کہ الفنسٹن جیسا شخص جس نے یورپ کی سرزمین میں پرورش پائی اور جس کی گھٹی میں آزادی نسواں پڑی ہو حبشی غلام کے سہارے پر سلطانہ کے چال چلن کو مشکوک سمجھے۔ اگر اس کی ذرہ برابر بھی اصلیت ہوتی تو وہ مورخین جنہوں نے ایمان کو کسی موقع پر ہاتھ سے نہ دیا۔ یہ نہ لکھتے کہ سلطانہ مدبرانہ رو پر بادشاہی کرتی تھی۔ باغیوں کی سازش کا شکار اکثر حکمران ہوئے ہیں اور آپس کی خانہ جنگیوں نے بڑے بڑے فساد برپا کئے ہیں۔ رضیہ کا معزول ہونا ان ہی وجوہ سے تھا جس کو تاریخ مروجہ نے اس کے چال چلن کی خرابی سے تعبیر کیا۔ وہ اصل میں نسل کی ترک تھی اور چہل کانی غلام ترک شروع سے اسکی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ اور باوجود سخت کوشش کے ان کا خوش رہنا سلطانہ کے اختیار سے باہر تھا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ التونیہ بھٹنڈے کا حاکم باغی ہوگیا۔ امراء اس کے ساتھ تھے اور سلطانہ کی طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ اس وقت سوا اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ سلطانہ نے التونیہ سے نکاح کیا اور اس طرح اپنی پاک دامنی کو اچھی طرح ثابت کر دیا۔ مگر اصلیت کچھ اور ہی تھی۔ چہل کانی غلام ترک اس فعل پر اور بھی برافروختہ ہوئے اور کیتھل پر ۱۲۴۰ء میں ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں سلطانہ کو شکست ہوئی۔

ترک اس کے خون کے پیاسے تھے رضیہ کے پاؤں اکھڑنے کی دیر تھی چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور بدنصیب رضیہ نے ایک گاؤں میں جا کر پناہ لی۔ ابن بطوطہ سلطانہ رضیہ کے قتل کا

واردات ان الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ شکست کھانے کے بعد رضیہ نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ دن بھر گاؤں میں پھرتی رہی۔ شام کے وقت جب بھوک سے بہت تنگ ہوئی تو زمینداروں سے سوال کیا۔ ایک کسان نے اس کی حالت پر رحم کھا کر آدھی روٹی اس کے حوالے کی۔ دن بھر کی تھکی ہاری ملکہ کو وہ سوکھی روٹی پلاؤ کی رکابی سے بہتر تھی سیر ہو کر کھائی اور پانی پیکر وہیں ایک کونے میں ڈھیر ہوگئی۔ لباس سر وانہ تھا۔ کسان کی نظر پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ فقیرنی کے لباس کے نیچے قبائے مرصع کا تکمہ جگمگا رہا ہے قریب آکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ عورت ہے اور بیش قیمت لباس و زیور سے مزین ہے۔ کم بخت نے لالچ میں آکر مصیبت ماری ملکہ کو جو اس کے ہاں مہمان اور پناہ گزین تھی قتل کر دیا۔ لباس اور زیور اتار کر لاش ایک کھیت میں دفن کی اور زیور لے کر جوہریوں کے پاس گیا۔ ایک گراں بہا انگشتری جس میں ہیرا جڑا ہوا تھا منحوس کسان کے پاس دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ پولیس کو خبر ہوئی اور کوتوال نے اس کو گرفتار کر کے تحقیقات شروع کی اور لاش کو کفن دے کر قطب صاحب کے کھنڈروں میں دفن کیا۔ اور ایک گنبد بنا دیا۔

ابن بطوطہ کا یہ واقعہ بھی بجائے خود زیادہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ قطب صاحب کے کھنڈروں میں رضیہ بیگم کے مقبرہ کا صحیح پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ اسکی قبر محلہ بلبلی خانے میں اجی جھجی کی درگاہ میں ہے۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ سلطانہ گرفتار ہو کر معزالدین بھرام شاہ کے حکم سے مع اپنے شوہر کے قتل کی گئی۔

ان تمام واقعات سے جو بیان کئے گئے یہ اچھی طرح معلوم ہو گیا

کہ تفریق مذہب کیسی مذموم شے ہے۔ ایک ایسی ملکہ جس نے تمام عمر اپنی پاک دامنی سے بسر کردی اور تا دمِ واپسین عصمت کو ملحوظ رکھا۔ متعصب مورخوں کی نگاہ میں بدچلن سمجھی گئی۔ حالانکہ تاریخ اس سے بہت زیادہ آزاد حکمران عورتیں ہمارے سامنے پیش کر رہی ہے اور مورخ اُن کی عفت و عصمت کے گیت گا رہے ہیں۔

تمدن ۱۹۱۳ء

نورجہاں

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے بعد ایسی یادگار چھوڑ جائیں کہ آنے والی نسلیں اُن کے نام پر فخر کریں غیر اُن کے کاموں اور ایجادوں سے فائدہ اٹھائیں عزیز اُن کی یاد اپنے دل سے بھلا نہ سکیں۔ نورجہاں بیگم کی ہڈیاں بھی مدتیں ہوئیں گل کر خاک ہو گئیں مگر جب تک دنیا اور دنیا میں زیب و زینت کا صحیح مذاق رکھنے والے موجود ہیں اُس کا نام فراموش نہیں کر سکتے۔ موجودہ زیوروں کی نزاکت، لباس کی قطع وضع فرش فروش ہمیشہ اُس کا نام زندہ رکھیں گے۔ جہانگیر کا بیان ہے کہ جب تک نورجہاں میرے گھر میں نہیں آئی میں زیب و زینت سے قطعی ناآشنا تھا۔

۹ فروری ۱۹۱۵ء

ارجمند بانو بیگم

زندگی کے بعد اگر خدا کی رضامندی حاصل ہو جائے تو بیڑا پار ہے اور اگر زندگی میں بیوی خدائے مجازی یعنی شوہر کی رضامندی حاصل کرے تو دُنیا اور دین دونوں گھر آباد ہیں۔

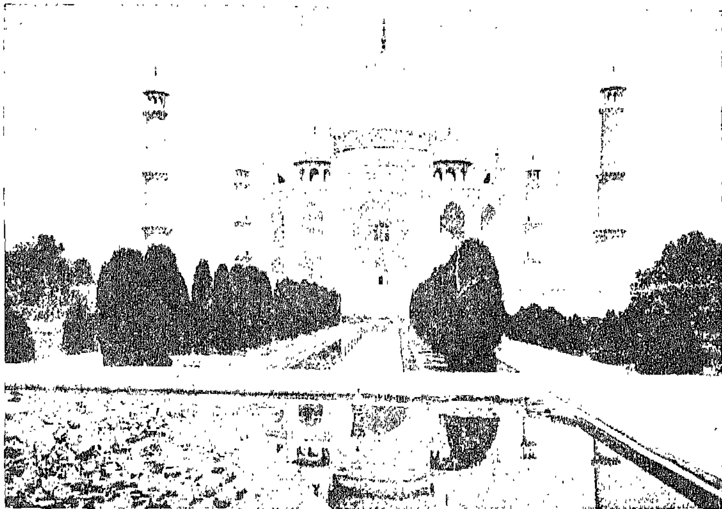
تاریخ ہم کو قدم قدم پر سبق دے رہی ہے کہ ہم میں کیسی کیسی بیویاں پیدا ہوئیں جن کے نام آج تک زندہ ہیں اور قیامت تک زندہ رہیں گے۔

ارجمند بانو بیگم جس کی زندگی تمام دُنیا کی عورتوں کے واسطے ایک نمونہ ہے آگرہ میں بظاہر پیوند خاک ہے مگر رحمت و برکت کے فرشتے ہر وقت اُس کے مزار پر پھول برسا رہے ہیں۔ وہ اپنی محبت اور اطاعت کی شوہر کے دِل پر ایسی یادگار چھوڑ گئی کہ شاہجہاں اس کے بعد چھتیس برس زندہ رہا مگر دوسری شادی نہ کی۔

عمر کا بڑا حصہ اس کی بے جان جسم کی خدمت میں صرف کر دیا اور تاج گنج ایک ایسی عمارت بنوا دی جو کہنے کو شاہجہاں کی دریادلی اور محبت مگر درحقیقت ممتاز محل ارجمند بانو بیگم کے خلوص کا ثبوت ہے۔



ارجمند بانو (ممتاز محل)



تاج محل

یہ بیگم مرزا غیاث کی پوتی اور نور جہاں بیگم کی بھتیجی تھی جو ۱۰۰۳ھ میں پیدا ہوئی۔ تعلیم نے اس کے حسن و جمال کو چار چاند لگا دیئے تھے جہانگیر کو اس سے اتنی محبت تھی کہ اس کا عقد اپنے بیٹے شاہجہاں سے کر دیا۔ یہ نکاح ۹ ربیع الاول شب جمعہ ۱۰۲۱ھ کو ہوا اور خود شہنشاہ جہانگیر نے مرزا غیاث کے گھر جا کر بہو کو انگوٹھی پہنائی اور موتیوں کا سہرا سر پہ باندھا۔ اس وقت بیگم کی عمر ۱۹ سال سات مہینے سات روز کی تھی۔ شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی اور ممتاز محل کا خطاب عطا ہوا۔

حُسنِ صورت کے علاوہ ممتاز محل کے پاس بڑا حُسن سیرت کا بھی تھا جس نے شاہجہاں کو فریفتہ کر دیا تھا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی مُہر بیگم کے پاس رہنے لگی۔ جب فرمان جاری ہوتے تو بیگم اپنے ہاتھ سے مُہر کرتی۔ اِس مرتبہ پر پہونچکر بھی وہ خدا سے غافل نہ ہوئی۔ نماز پنجگانہ ادا کرتی۔ یتیموں کی پرورش، فریادیوں کا انصاف، مظلوموں پر رحم اس کا خاص شیوہ تھا اور صرف اِن ہی کاموں کے واسطے اس نے خانم کو مقرر کر رکھا تھا۔

شاہجہاں کو اس بیگم سے اِس قدر محبت تھی کہ وہ سفر، سیر، شکار غرض ہر جگہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ۱۰۴۱ھ میں برہان پور میں اڑتیس سال کی عمر میں اس بیگم نے دُنیا سے رحلت کی اور اپنے بعد یہ بتا گئی کہ میاں بیوی کے تعلقات کیسے ہوتے ہیں۔

ذیقعدہ کے مہینہ میں جو ماہ وفات تھا شاہجہاں جب تک زندہ رہا ماتم کرتا رہا۔ اور عید بقر عید پہ ہمیشہ اِتنا روتا تھا کہ ہچکی بندھ جاتی تھی۔

عصمت ۱۹۲۳ء

شہنشاہ جہانگیر کا ایک انصاف

غیر مسلم مورخوں نے بعض بعض موقعوں پر مسلمانوں کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیا ہے کہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے۔ غور سے دیکھئے تو مورخ کی ذمہ داری کچھ کم نہیں۔ اس کا کام اس کے بعد صدیوں رہنے والا ہے اور یہ وہ کام ہے جس پر قوموں اور نسلوں کی معلومات اور واقفیت کا انحصار ہے۔ مگر جب مورخ کی آنکھ پر تعصب کی عینک ہو تو اصلی واقعات روشنی میں نہیں آسکتے جس طرح کسی مذہبی جھگڑے کے فیصلہ میں مصنف وہ شخص سمجھا جا سکتا ہے جس کا خود مذہب سے تعلق نہ ہو۔ اسی طرح مورخ کے واسطے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے مذہب کا دیوانہ اور دوسرے کا دشمن نہ ہو اور پھر بھی اس کی رائے کو کامل تحقیقات کے بعد وزن دیا جائے۔ یہی سبب ہے کہ اسلام نے حدیث کی پوری چھان بین کی اور جب تک اطمینان کامل عین الیقین کے درجہ تک نہ پہونچا۔ کسی لفظ کو حدیث میں شامل نہ کیا۔ لیکن مورخ کی یہ حیثیت نہ ہو تو تاریخ بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔

جو شخص سلطانہ رضیہ کے نام سے واقف ہوگا وہ یہ بھی کہتا ہوگا کہ سلطانہ ایک غلام پر بہت زیادہ مہربان تھی۔ جو اورنگ زیب کو جانتا ہوگا وہ یہ بھی رائے رکھتا ہوگا کہ نہایت سخت اور سنگ دل بادشاہ تھا۔

جس نے جہانگیر کا حال پڑھا ہوگا اُسنے یہ بھی پڑھا ہوگا کہ ہر وقت نشہ میں بیہوش رہتا تھا اور سلطنت نورجہان بیگم پر قربان کردی تھی۔ خاص افراد کو چھوڑ کر جن کو تاریخ کے مطالعہ کا خاص شوق ہے۔ عام طور پر تو خواہ کوئی ہو اس نے یہ ہی سُنا اور پڑھا ہوگا۔ لیکن حقیقت اس سے کوسوں دور ہے۔

شہنشاہ جہانگیر کے متعلق تم نے ہمیشہ یہ ہی سُنا کہ نشہ میں ہر وقت بیہوش رہتا تھا اور سوا بیگم کے کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ سلطنت کے کاروبار سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا۔ مگر مجھے ان دنوں میں ایک کتاب "ھننت عدل" کے نام سے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ پُرانے زمانے کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ اور اس میں شہنشاہ جہانگیر کے آٹھ انصاف ایسے درج ہیں کہ اگر کوئی بادشاہ اپنی تمام عمر میں ایک بھی انصاف ایسا کرے تو بلاشبہ اس کا فیصلہ ثابت کر سکتا ہے کہ وہ رعیت کا مہربان بادشاہ تھا۔

نوشیرواں بادشاہ کا نام بہت مشہور ہے۔ اس کا یہ انتظام خاص شہرت رکھتا ہے کہ اُس نے ایک زنجیر عدل اپنے محل پر لٹکا رکھی تھی کہ جو فریادی آئے زنجیر ہلا دے۔ نوشیرواں کے بعد یہ فخر بادشاہ جہانگیر کو حاصل ہے کہ اُس کے محل پر زنجیر عدل لٹکائی گئی۔ اور ہر فریادی کو اجازت تھی کہ جس وقت چاہے قلعہ پر آکر زنجیر ہلا دے۔ بادشاہ خود پہنچتا تھا فریاد سُنتا تھا اور انصاف کرتا تھا۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ ہوتے تھے جو ماتحت عدالتوں سے مایوس ہو جاتے تھے۔ اور قاضیوں مفتیوں کے ہاں ناکام رہتے تھے۔ ہماری عقل کام نہیں کرتی کہ ان جلیل القدر بادشاہوں کا جنہوں نے اپنا عیش و آرام رعیت پر خود قربان کر دیا۔ خود اذیت اُٹھائی اور انصاف کو ہاتھ سے نہ دیا۔ مضحکہ اُڑانے کا کس کو حق حاصل ہے۔ تا فون: ضابطہ

جمہوریت ہزار ہوں تو ان عالی مرتبت بادشاہوں کے آگے پانی بھرتے ہیں۔ ہم مشت عدل کا ایک واقعہ لکھتے ہیں۔

غروب آفتاب سے قبل یہ عالی مرتبہ بادشاہ قلعہ میں بیٹھا تھا کہ کسی فریادی نے زنجیر ہلائی اور بادشاہ جہانگیر فوراً دروازہ پر پہنچا تو فریادی نے عرض کیا۔

جہاں پناہ میں سفر کے واسطے گیا تھا۔ چلتے وقت ایک ہزار اشرفیوں کی تھیلی فلاں شخص کے پاس امانت رکھ گیا۔ چاروں طرف اپنی مہریں کیں اور پورا اطمینان کر لیا۔ اب جو واپس ہو کر تھیلی مانگی تو اس نے فوراً واپس کر دی۔ مہریں تمام و کمال بدستور موجود تھیں، کہیں ٹوٹنے اور کھولنے کا شبہ تک نہ تھا۔ یہ حضور ملاحظہ فرمالیں۔ مگر اوپر سے سر اکھول کر دیکھا تو اشرفیوں کی بجائے پیسے بھرے تھے۔ میں قاضی کی عدالت میں گیا مہریں موجود تھیں دعوے خارج ہوا۔ مرافعہ کیا وہ بھی نامنظور ہوا اور ہونا چاہیے تھا کہ ہر مہر موجود ہے۔ اب خدمت شاہی میں اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ عمر بھر کی کمائی یہ اثاثہ تھا۔ دو جوان لڑکیاں گھر میں موجود ہیں۔ ایک کی شادی سر پر ہے حیران ہوں کہ کیا کروں۔

شہنشاہ عالی مقام نے تھیلی چاروں طرف سے دیکھی اور فرمایا "ایک مہینہ بعد آنا۔ بہ ظاہر تمہارا کوئی ثبوت نہیں مگر خیر خدا مالک ہے"۔

دوسرے روز دیوان خاص سے فرصت پانے کے بعد میر فراش کو حکم دیا "بغیر ہمارے حکم کے قالین نہ بدلا جائے"۔ میر فراش سمجھا قالین چونکہ ایرانی اور جڑاؤ ہے شاید بادشاہ کو پسند ہے۔ بات گئی گذری ہوئی۔ ایک ہفتہ اسی طرح گذر گیا۔ ایک روز جب شہنشاہ عالی مقام تنہا تھا چاقو سے قالین

بیچ میں سے چاک کر دیا۔ شام کے وقت جب میر فراش نے قالین پھٹا ہوا دیکھا فوراً تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر ساتھ ہی حکم کا خیال آیا۔ سخت پریشان ہوا کہ کیا کرے۔ ہر چند کوشش کی کہ پھاڑنے والے کا پتہ چلے مگر ناکام رہا۔ مجبوراً راتوں رات ایک ایسا رفوگر تلاش کیا جو اپنے فن میں بے مثل تھا۔ قالین رفو ہو گیا اور ایسا رفو کہ پتہ چلنا ناممکن۔ صبح بادشاہ سلامت تشریف لائے تو دیکھا کہ رفو ایسا ہوا ہے کہ جو اپنا جواب نہیں رکھتا۔ میر فراش کو بلا کر حکم دیا کہ رفوگر کو حاضر کرو۔

دربار شاہی آراستہ ہے۔ میر فراش، مدعی، امین رفوگر چاروں سرنگوں حاضر ہیں کہ بادشاہ نے رفوگر سے دریافت کیا۔ اِس مدعی کی یہ تھیلی تم نے رفو کی؟ رفوگر نے سر نیچا کیا اور اعتراف جُرم پر مجبور ہوا۔ اس کے بعد امین سے سوال کیا، اُس کو بھی اِس کے سوا چارہ نہ تھا۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ امین فوراً مدعی کی اشرفیاں حوالے کرے اور قاضی جس قدر مناسب سمجھے سزا دے۔

اِس واقعہ کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اِس جمہوریت اور ضابطہ و قانون کے دور میں مشرق کی اِس واویلا کی جہاں اور وجوہ ہوں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ وہ ان باتوں کا عادی ہے جن کو خواہ فرض شاہی کہو یا لغویات۔

عصمت ۱۹۲۴ء

سلطان عبدالحمید کی معزولی

پندرہ بیس برس کا ذکر ہے جب لکھنے پڑھنے کا نیا نیا شوق پیدا ہوا تو جن کتابوں میں بہت ہی جی لگتا تھا اُن میں سے ایک شاہِ روم کا قصہ بھی تھا۔ قصہ تھا تو فرضی مگر کچھ ایسا موثر اور نتیجہ خیز کہ ایک ایک حرف کلیجے میں گڑتا تھا! بادشاہ کا تلاوت کلام اللہ میں اس آیت پر پہنچنا کہ جس کو چاہیں ہم عزت دیں جس کو چاہیں ذلت، اور اُس میں یہ وسوسۂ شیطانی پیدا ہونا کہ اس جاہ و حشمت پر جو مجھ کو میسر ہے کس طرح ذلت حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک روز شکار کے پیچھے گھوڑا ڈالنا، فوج سے بچھڑنا، سرحد چین میں پہنچنا اور قزاق کے شبہ میں گرفتار ہونا۔ ہاتھ پاؤں کٹنے، جیل خانہ میں پڑنا اور بالآخر شہزادی کا اتالیق مقرر ہو کر اسی آیت کا سبق دینا جس نے یہ دن دکھایا۔ غرض یہ تمام باتیں گو دل کو لگتی ہوئی نہ ہوں۔ مگر سلطنتِ روم کے بادشاہ کا شہنشاہ دو جہاں کے حکم پر ہنسنا اور اُس کی پاداش میں طرح طرح کے مصائب میں گرفتار ہونا ممکن ضرور ہے۔ کیا خبر تھی کہ یہ نقلی واقعہ ہماری آنکھوں دیکھتے اصلی ہو جائے گا اور اسی سلطنت کا موجودہ حکمران سلطان عبدالحمید خاں جس کی عظمت کا سکہ ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اُس سے زیادہ مصیبت میں گرفتار ہو گا! کان سنیں گے کہ جس عبدالحمید کی ذات کے ساتھ

مُسلمانوں کے بہت سے تعلقات وابستہ ہیں۔ وہ حراست میں پہونچ گیا اور آنکھیں دیکھیں گی کہ وہی سُلطان جس کے دم کے ساتھ لاکھوں بلکہ کروڑوں مُسلمانوں کی جانیں لڑی ہوئی ہیں۔ ننگی تلواروں کے پہرے میں قیدی بنا چلا جا رہا ہے۔ مرد یا عورت شاید ہی کوئی ایسا مُسلمان ہو جس کے آنسو اِس انقلاب سُلطانی پر نہ گرے ہوں۔ پتھر سے دل رکھنے والے بھی ایک دفعہ موم ہو جائیں گے۔ جب سُنیں گے کہ بے گناہ عبد الحمید جب اپنی زندگی کا تمام حِصّہ رعیت پر قربان کر چکا اور مرنے کے قریب پہنچا تو احسان فراموش رعیّت نے اُس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کو سُنکر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ عبد الحمید خاں ہی کا صدقہ اور اُسی کے دم کی برکت تھی کہ وہی سلطنت جو بیمار سمجھی جاتی تھی تیس بتیس برس کے دورِ حکومت میں ایسی تندرست و توانا ہو گئی کہ روس و یونان وغیرہ جو یہ سمجھتے تھے کہ اِس مریض سلطنت کو جب چاہیں گے چٹکی میں مسل دیں گے عبد الحمید کا لوہا مان گئے اور جان گئے کہ ترکی مُنہ کا نوالہ نہیں ہے۔

واقعات شاہد ہیں کہ عبد الحمید کے ہاتھ میں مُلک کی باگ ایسی حالت میں آئی کہ یہ بیمار و مریض سلطنت جاں کنی تک کا مرحلہ طے کر چکی تھی اور کوئی دم جاتا تھا کہ روح جسد خاکی سے پرواز کرے۔ ۱۸۷۷ء کا نازک زمانہ تھا روس کی فوجیں فتح کے نعرے لگاتی ہوئی قسطنطنیہ تک آپہنچی تھیں اور شہر پناہ پر ڈیرے ڈال دئے تھے۔ ایسی سراسیمگی اور نا اُمیدی کی حالت میں جب ہوا خواہانِ سلطنت کو ہر طرف سے مایوسی دکھائی دی اور یقین کامل ہو گیا کہ یہ سرزمین جس کو مُسلمانوں نے اپنے خون سے سینچ کر لالہ زار بنایا

یہ در و دیوار جہاں تقریباً تیرہ سو برس سے اسلامی جھنڈا لہرا رہا ہے۔ یہ عالیشان مسجدیں جو آج تک اُن مٹنے والوں کی عظمت و عقیدت کا پتہ دے رہی ہیں۔ جنہوں نے مُلک و قوم کی محبت میں اپنی جانیں قربان کر دیں اور جن میں کلمۂ توحید اور اذانوں کی صدا ہوا میں گونج کر غیر مذہب والوں کے بھی دل ہلا دیتی ہے۔ یہ پُرانے قبرستان اور ٹوٹے ہوئے کھنڈر جن کے آغوش میں بہادرانِ اسلام میٹھی نیند لے رہے ہیں! یہ اسلام کی پرانی نشانیاں آج مسلمانوں کے ہاتھ سے چھن کر روسیوں کے قبضے میں پہنچیں اُس وقت اِس کے سوا چارہ نہ تھا کہ فدائیان ملک و مذہب حیران و پریشان نوجوان شہزادے عبدالحمید کے حضور میں اپنی فریادیں لے کر پہنچے اور عرض کیا کہ تاج شاہی سر پر رکھیے اور اسلام کی اِس ڈوبتی ہوئی کشتی کو جو چاروں طرف سے طوفان میں گھر گئی کسی کنارے پر پہنچائیے۔ دور اندیش سُلطان نے کامیابی مفقود دیکھ کر جواب دیا "برادرانِ اسلام مُسلمانوں کی سلطنت کا خاتمہ میرے نام پر نہ کرو۔ غنیم نے فتح کا ڈنکا بجا دیا۔ وفادار و نمک حلال کام آ گئے ہیں اِس تاج کو لیکر کیا کر سکتا ہوں"۔

یہ واقعہ بیّن ثبوت ہے اِس بات کا کہ نوجوان سلطان کو سلطنت کے لینے کا کوئی ارمان نہ تھا مگر ایک جمِ غفیر کا اصرار اور سب سے بڑھ کر والدۂ محترمہ کا حکم تھا جس نے مجبور کیا اور سُلطان عبد الحمید اِس نازک اور نفسا نفسی کے عالم میں تخت پر رونق افروز ہوئے۔

کون کہہ سکتا تھا کہ وہ مریض جس کو دُنیا بھر کے حکما جواب دے چکے اور جو اپنی زندگی کے کچھ سانس پورے کر رہا تھا۔ ایک عبد الحمید کے ہاتھ لگ جانے سے ایسا چاق و چوبند ہو جائے گا کہ بڑے بڑے شجاع اِس کی دلیری کے قائل ہو جائیں گے۔

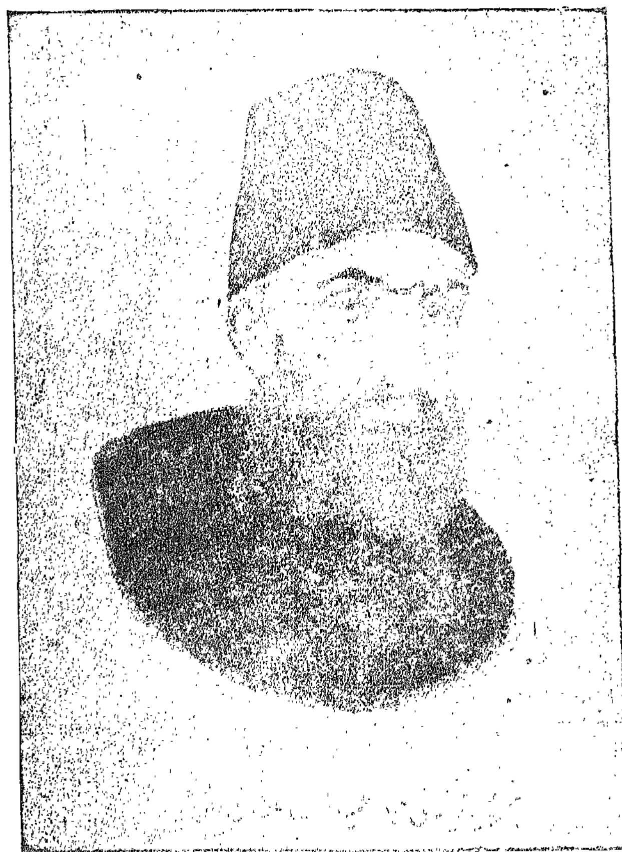
کِس کو اِنکار ہو سکتا ہے کہ معزول سُلطان نے سلطنت کو ترقی دینے میں نہ صرف راتوں کی پیاری نیندیں حرام کیں بلکہ چین کھویا آرام گنوایا اور اپنی جان پر طرح طرح کی تکلیف و مصیبت اُٹھا کر سلطنت کو اِس قابل بنایا کہ جو مریض و بیمار کے نام سے تعبیر کرتے تھے وہ بھی اس کی طاقت کو تسلیم کرنے لگے۔ ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا کہ یہ قبر کا مردہ سلطنت عبد الحمید کے زیر علاج رہ کر اِس قابل ہو جائے کہ دلاوران یونان کے چھکے چھڑا دے بڑے بڑے مدبر بڑے بڑے دور اندیش اپنی سلطنتوں کو یہ نصیحت کریں کہ جب تک عبد الحمید اِس تخت پر ہے ٹرکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھنا۔

نوجوان ترک اچھی طرح جانتے تھے کہ جس وقت ملک کا بچّہ بچّہ خوابِ غفلت میں ہوتا تھا بڑے بڑے جلیل القدر وزرا و اُمرا سے لے کر فقیر و محتاج تک پڑے سوتے تھے اُس وقت عبد الحمید کا دماغ سلطنت کی پیچیدہ گتھیاں سُلجھایا کرتا تھا! آہ! وہ عبد الحمید جِس نے مُسلمانوں کے واسطے راتیں آنکھوں میں کاٹیں وہ عبد الحمید جِس نے رعیّت کی فلاح و بہبودی کے واسطے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اس سزا کا مستوجب نہ تھا کہ بڑھاپے میں ایسی ذلّت بُھگتے! تخت چھنے دولت ضبط ہو اور جلاوطن کیا جائے۔

کلیجہ کٹتا ہے جِس وقت سُلطانی مصیبتوں کا خیال آتا ہے۔ یہ بڑھاپے کی عمر اور ایسے ظلم۔ بچے چھوٹے۔ بیگمیں جُدا ہوئیں۔ عزیز و اقارب کہیں کے کہیں پہنچے۔ اور وہ شخص جِس کے ایک اشارے میں لاکھوں بلکہ کروڑوں بندگانِ خدا کی جان تھی۔ ٹر دن ٹوں سالونیکا بھیج دیا گیا۔

سے عبدالحمید خاں کی آخری حالت سُنکر بے اختیار سچا دل خون کے آنسو روتا ہے اور دُنیا کی ناپائداری کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ جاتا ہے۔ جس وقت یہ فیصلہ ہوگیا ہے کہ آج ترکی شہنشاہ سے تخت و سلطنت چھین کر اُس کو بے تاج کردو اُس وقت رعایائے ترکی میں سے کسی کی ہمت نہ پڑی کہ یہ وحشتناک خبر گوش سلطانی تک پہنچاتا۔ بہ مشکل تمام چار شخص منتخب کیے گئے جو یہ اطلاع دیدیں کہ اے وہ سلطان جس نے اپنا چین اپنا سُکھ اپنی راحت اپنا آرام سب رعیت پر قربان کیا۔ آج تیری رعیت تیری محبت تیری قدرت تیری عظمت سب پر خاک ڈالتی ہے تیرے احسان اور تیری شفقتیں سب بھُلا کر تیرا تاج چھینتی ہے اور تجکو قیدی بناتی ہے۔ ان بزرگوں میں سے ایک شخص گراسو آفندی کا بیان ہے جس وقت ہم چاروں کوشک یلدیز یعنی محل سُلطانی پر پہنچے میرا دل رعب سُلطانی سے لرز رہا تھا۔ سب سے پہلے ہم اُس کمرے میں پہنچے جہاں سکرٹری عرض و معروض کرتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ہر وقت تلواریں چمکتی تھیں اور فوجی گارد دست بستہ موجود رہتا تھا۔ مگر اس وقت یہاں ہُو کا میدان تھا اور ایک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر میرا دل بھر آیا مگر حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ ہم آگے بڑھے، چاروں طرف سُنسان تھا جس جگہ ہر وقت سنگینوں کے پہرے اور چوب دار وردیاں نظر آتی تھیں وہاں ایک ویرانی برس رہی تھی اور وہی کوشک یلدیز جس میں سُلطان عبدالحمید خان شہنشاہ ترکی موجود تھا اُس کے دُور دُور تک کسی کی سانس لینے کی بھی آواز نہ تھی۔ بالآخر ہم اُس عظیم الشان محل میں پہنچے جہاں سوا بیگمات کے پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ اِس ہال کا اسباب، نقرئی و طلائی کرسیاں زمردی محرابیں جواہرات سے مفرّق، فرش فروش اپنے جلیل القدر سُلطان کی سلطنت کا سکّہ دلوں پر بٹھا رہا تھا۔ مگر یہ دیکھکر ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو گر پڑے

داستان پاریفه



کہ وہ سرزمین جس کی یہ کچھ قدر و منزلت تھی آج اُس پر حسرت برس رہی ہے۔ انواع و اقسام کی بے نظیر اشیا ر خاک میں اٹ رہی تھیں اور کوئی اتنا نہ تھا کہ یہ گرد جھاڑے۔ گو یہ سین دیکھ کر ہماری حالت غیر ہو گئی مگر ہم نے دل کو سنبھالا اور مجبور و معذور محل سلطانی کے زنانے حصے کی طرف چلے۔ خوش قسمتی سے ہمیں یہاں دو خادمہ عورتیں ملیں جو اپنے آقا کی حفاظت جان پر مستعد حقِ نمک ادا کر رہی تھیں ہم کو دیکھ کر اُن بیچاری عورتوں کو اپنے مالک کی محبت نے جس کا نمک اُن کی رگ رگ میں بھرا ہوا تھا سراسیمہ کر دیا اور اُن کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ سلطان کا نشان دینے سے انکار کیا۔ مگر جب ہم نے اُن کو یہ یقین دلا دیا کہ سلطان کی جان محفوظ ہے تو یہ اندر گئیں اور تھوڑی دیر بعد تشریف آوری کی خبر لائیں۔

جس شخص کی باریابی کی اُمید میں بڑے بڑے وزراء اور سلطنت کے سفیر گھنٹوں بیٹھنا اپنا فخر سمجھتے تھے آج اُس کا انتظار ایک ایک لمحہ ہم کو ایک ایک سال تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد سلطان تشریف فرما کر شاہی کرسی پر رونق افروز ہوئے۔ ہم چاروں ایک ایک کر کے اندر داخل ہوئے ادب سے سلام کیا اور چپکے کھڑے ہو گئے۔ ہماری آنکھیں رعب و داب سے نیچی تھیں اور ہم فلک کج رفتار کی اس نیرنگی اور زمانے کے انقلاب پر غور کر رہے تھے۔ آخر ہمیں ادائگی فرض کا خیال آیا اور آنکھ اُٹھائی تو دیکھا کہ وہ حسرت ناک تصویر ہمارے سامنے ہے۔ ہاتھ کانپ رہے تھے بدن لرز رہا تھا اور وہی سلطان جو رعیت کی دھن میں آج بڈھا ہو کر ہماری آنکھوں کے سامنے بیٹھا تھا رعیت کا فیصلہ سننے کا منتظر تھا۔ اسعد پاشا آگے بڑھے اور یہ الفاظ کہے۔

"حضور پر نور! ہم اس غرض سے حاضر ہوئے ہیں کہ آپ کو اطلاع دیدیں کہ قوم آپکو شرعی فتوے کے بموجب تخت سے علیحدہ کرتی ہے"۔

اللہ اللہ کیسا جگر خراش سانحہ اور کتنا درد انگیز فقرہ ہے! تیری شان تجھی کو سزاوار! وہ شخص جس کی عمر کا بیشتر حصہ اس طرح بسر ہوا کہ اسکے آنکھ اٹھانے کی دیر تھی، اُس کے ادنٰے اشارے پر قسطنطنیہ اور نہ صرف قسطنطنیہ بلکہ تمام ترکی اور نہ صرف ترکی بلکہ آس پاس کی سلطنتوں تک میں تہلکہ مچ جاتا تھا۔ وہ شخص جس کی بھوں نے سلطنت یونان کے پرخچے اڑا دیئے آج ہوا اُسکے کانوں تک یہ الفاظ پہنچا رہی ہے کہ اس کرسی پر یہ نشست آخری نشست ہے۔ اور اے عبدالحمید شہنشاہی کا خاتمہ ہوا، اب قیدیوں کی زندگی بسر کر۔ اِن الفاظ نے سلطان کے جسم میں ایک ہلکی سی تھرتھری پیدا کردی۔ مگر اس ہمت و مردانگی کو شاباش، غصے یا ناخوشی کا ایک لفظ زبان سے نہ نکلا۔ کچھ دیر سکوت کرنے کے بعد فرمایا۔

"اور میری جان"

جواب میں یہ سُن کر کہ "قوم نے آپ کی جان کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کیا" کچھ دیر تامل کر کے دریافت کیا۔

"میرے بال بچوں کے متعلق"

فوجی حکام جو ہمارے ساتھ تھے اُس وقت آگے بڑھے اور سلطان نے اُن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا یہ فوجی اصحاب قسم کھاتے ہیں کہ میری جان سے تعرض نہ کریں گے"۔

جب ہم نے حفاظت جان کا یقین دلادیا تو وہ خاموش ہو گئے۔

اِس دردناک واقعہ کے اختتام پر جو آخری الفاظ بد سلطان کی زبان سے

نکلے ہیں، انکو سنکر سخت سے سخت دل پر بھی چوٹ لگتی ہے! اِس خموشی کے بعد دفعتہً کچھ خیال آیا اور ایک حسرت آمیز نظر سے سلطان نے ان چاروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"دو روز ہوگئے کوئی نوکر میرے پاس آکر پھٹکا تک نہیں، میرے کھانے پینے کی بھی کسی نے خبر نہیں لی۔ اب میری یہ حالت ہوگئی کہ حرم میں پڑا رہتا ہوں! میں مجبور ہوں مشیّت ایزدی یہی تھی احکم الحاکمین اس کا فیصلہ کرے گا۔ اور اُن لوگوں سے سمجھے گا جنہوں نے یہ مصیبت ڈالی۔ ایک آخری درخواست کرتا ہوں قبول کرلو۔ یہاں سے نکالنے ہو تو محل چراغاں میں بھیج دو۔ یہ میری پیدائش کی جگہ ہے جس سرزمین پر پیدا ہوا ہوں وہیں خاتمہ ہو جائے"!

افسوس صد افسوس بدنصیب سلطان کی یہ آخری درخواست بھی رعیّت نے منظور نہ کی اور سلطان نے بہ خوشی و خرمی اپنے تئیں فوج کے سپرد کر دیا۔

مئی کا پہلا اور دوسرا ہفتہ تھا جب بیگمات دور دراز مقامات پر پہنچائی گئی ہیں اور اُن کی سواریاں شہر سے گذری ہیں عجیب دردانگیز سماں تھا چاروں طرف سے لوگ اس عبرتناک موقع کو دیکھنے کو آرہے تھے اور خون کے آنسو رو رہے تھے۔ جیسی سلطان عبد الحمید پر آکر پڑی خدا ایسی مصیبت دشمن پر بھی نہ ڈالے۔ اور گو عبد الحمید ہمارا بادشاہ کبھی نہ تھا خلیفۃ المسلمین تھا اب وہ بھی نہ رہا اور چند روز میں موت اُس کی تمام تکالیف کا خاتمہ کر دے گی۔ مگر اے عبد الحمید معزول عبد الحمید جب تک دنیا و دنیا میں تاریخ قائم ہے تیرا نام مرنے والا نہیں۔

عصمت ۰۹ء

شاہِ ایران

غور و تامل سے دیکھنے والی بہنوں کو انسانی تاریخ میں بیسیوں کیا سیکڑوں واقعات ایسے ملے ہوں گے جو اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ شہنشاہ عظیم الشان ہو یا بہادر پہلوان۔ انقلابِ زمانہ نے چٹکی بجاتے میں تہتروں کے بچوں کو پہونچا دیا۔ اب یہ ہماری غفلت یا انسانیت کا تقاضا سمجھو کہ کبھی یہ اندیشہ نہیں ہوتا کہ ہماری موجودہ حالت پل مارنے میں بدتر سے بدتر ہو سکتی ہے۔ جو دم گذر گیا اچھا ہے اور جو وقت اطمینان سے بسر ہو رہا ہے غنیمت ہے۔ دنیا اور ہر وہ چیز جو دنیا میں موجود ہے فانی۔ نہ انسان کو ثبات نہ انسانی حالت کو قرار۔ خوش نصیب ہیں وہ بہنیں جنہوں نے عروج کے بعد زوال کی صورت نہ دیکھی اور دریائے انقلاب کی زبردست موجوں کے تھپیڑے نہ کھائے عقل و ہوش والی بہنیں اس نعمت کا شکر کریں اور یہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ آسمان طوطے کی طرح دیدے بدلنے والی چیز ہے۔ اس کو رخ پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ یہ پیرزال دنیا مشہور بے وفا ہے اس نے ہزاروں اور لاکھوں ہم ہی جیسی اللہ کی بندیوں کو تختِ شاہی سے اتار کر بھیک منگوادی۔ تاج شاہی چھینا در در کی ٹھوکریں کھلوائیں جو ہاتھ ہمیشہ سونے چاندی اور جواہرات سے کھیلتے رہتے تھے دوسروں کے محتاج ہو گئے۔

امام ابوسفیان ثوری نے ہارون رشید کو ایک خط میں کیسی معقول بات لکھی ہے فرماتے ہیں :- سلطنت پر زیادہ گھمنڈ نہ کیجیو۔ یہ وفادار ہوتی تو تجھ تک نہ پہونچتی۔ جس طرح پھرتی پھرتی تجھ تک آئی اسی طرح چند روز تیرے پاس رہ کر اور کے پاس جانے والی ہے۔ اس بے ثباتی کا ثبوت مامون رشید کی اس مناجات سے ملتا ہے۔ جس وقت مرض الموت شروع ہوا تختِ شاہی چھوڑ کر فرشِ خاک پر لیٹا۔ آسمان کی طرف رُخ کیا اور کہنے لگا:-

"اے وہ بادشاہ جس کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں آج اُس بادشاہ پر رحم کر جس کی سلطنت ختم ہوئی۔"

چند روز ہوتے تاریخِ بغداد میں ایک ایسا واقعہ دیکھا جس کو سُن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور انقلابِ زمانہ کی پوری تصویر آنکھ کے سامنے پھر جاتی ہے۔ جب ہارون رشید کا مشہور وزیر جعفر برمکی (یعنی وہ شخص جس کی بخشش نے ہزاروں خاندان پونڑوں کے امیر بنادیئے۔ جس نے ایک ایک قصیدے کے صلہ میں لوگوں کو مالا مال کردیا جس نے ایک ایک سائل کو لاکھوں درم خیرات کئے۔ جس کے دروازہ سے مہمان مکانوں کے قبالے اور جائداد کے ہبہ نامے لے کر نکلے) قتل ہو چکا ہو تو ایک روز عید کی صبح کو جس وقت بغداد کے لوگ عید گاہ جانے کی تیاریاں کررہے تھے۔ ایک عورت اپنے لڑکے کے واسطے کپڑے درست کر رہی تھی۔ دفعتہً اس گھر میں ایک بڑھیا عورت داخل ہوئی جس کے پاجامہ میں کئی پیوند تھے اور سر پر نہایت کثیف پھٹی ہوئی چادر تھی اُس بڑھیا کی باتوں میں صاحب ایسی محو ہوئی کہ بچے کے کپڑوں کا مطلق خیال نہ رہا۔ جب نماز کا وقت قریب آگیا تو لڑکا بادلِ ناخواستہ میلے ہی کپڑوں سے

چلا گیا۔ مگر واپس ہو کر باپ سے شکایت کی کہ اس بڑھیا کی باتوں میں ایسی پھنسیں کہ میری عید کی خوشی بھی کرکری کر دی۔ یہ بڑھیا کون تھی؟ ماں نے یہ سُنکر ٹھنڈا سانس بھرا۔ بیٹے کی طرف دیکھا اور دیکھ کر کہا "یہ خاتون جعفر برمکی وزیر ہارون رشید کی ماں تھی جس نے آج ہی کے روز گذشتہ عید کو چار سو خلعت گراں بہا تقسیم کئے تھے۔"

ابھی کل کا ذکر ہے کہ عبد الحمید خاں کی حسرتناک کیفیت کان سُن چکے ہیں آج وہی آواز محمد علی شاہ ایران کی بابت آرہی ہے۔ یہ وہی محمد علی ہے جس کے اوپر سے ہزاروں مسلمان اپنی جانیں قربان کر گئے اور آج جنگل بیابان میں سو رہے ہیں۔ یہ وہی شاہِ ایران ہے جس کے ادنیٰ اشارے پر نمک خواروں نے مملکت ایران میں خون کے دریا بہا دیئے۔ یہ وہی شخص ہے جس کے تیوری پر بل آتے ہی سیکڑوں گھر غارت اور ہزاروں آدمی خانماں برباد ہو گئے۔ غرض جس شخص کے قبضہ قدرت میں ہزاروں اور لاکھوں بندگانِ خدا کی جانیں تھیں جو ۱۳ جولائی کی رات کو یہ حکم دے رہا ہے کہ مفسدوں کا سر کچل دو۔ اُن کا ایک مرد زندہ باقی نہ رہے ۱۳ کی صبح اس پر یہ روز سیاہ لاتی ہے کہ شہر کے تمام حصّوں پر گولہ باری ہو رہی ہے خطرناک گولے محل شاہی سے آآ کر ٹکرا رہے ہیں۔ خوشامدی سپاہی نوکر چاکر جانوں کے خوف سے روپوش ہیں اور جس شخص کے تلووں کے نیچے بڑے بڑے جلیل القدر آنکھیں بچھاتے تھے آج اُس کے پاس بیوی اور بچوں کے سوا اللہ کا نام ہے۔ بچے رو رہے ہیں۔ بیگم گریہ وزاری کر رہی ہے اور محمد علی شاہ اتنا موقعہ ڈھونڈ رہا ہے کہ اگر تھوڑی دیر کی بھی مہلت مل جائے تو بیوی بچوں کا ہاتھ پکڑ کسی طرف نکل جائے۔

اے فلک کج رفتار اور اے دنیائے ناپائدار لعنت ہے تیری نیرنگیوں پر! محلوں کی بیٹھنے والی بیگم گم سم کھڑی ہے۔ پھلواسے بچے بھوک سے بے تاب ہو رہے ہیں اور مرزا محمد علی شاہِ ایران حسرت سے بیوی بچوں کا منہ تک رہا ہے۔ ایک نامہ نگار کا بیان ہے کہ ۱۶ تاریخ کو بادشاہ بیگم اور بچوں سمیت روسی سفیر کی پناہ میں مقام اسکندہ پہونچے اُس وقت بیگم کی آنکھ سے آنسو بہ رہے تھے۔ سفیر کی میم نے اپنے رومال سے آنسو پونچھے اور ہر طرح کی تسلی تشفی دی۔

۹ ستمبر کی صبح اس سے بھی زیادہ دل خراش تھی جس روز بادشاہ اور بادشاہ بیگم کو تخت و تاج سے دستبردار ہو کر جلاوطن ہونا پڑا۔ دونو میاں بیوی بیٹھے اپنی قسمت پر رو رہے تھے۔ وطن کی محبت تاجِ شاہی کا فراق کلیجہ مسل رہا تھا اور مصیبت پڑے دل اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ جب طہران پر ایک آخری اور حسرت بھری نظر ڈال کر ملک و سلطنت کو ہمیشہ کے واسطے الوداع کہہ دیں۔

ایک ایرانی اخبار کا بیان ہے کہ محمد علی اس وقت دم بخود تھا مگر بیگم کی گریہ وزاری لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہی تھی۔ وہ اپنے کلیجہ کے ٹکڑے پرنس سلطان احمد مرزا کے فراق سے ڈاڑھیں مار مار کر رو رہی تھی۔ شہزادے کی جدائی جس کی عمر ابھی تیرہ سال کی ہے ماں کو خون کے آنسو رلا رہی تھی۔ دنیا اُس کی آنکھوں میں اندھیر تھی۔ ہر چند لوگ تسلی دے رہے تھے مگر وہ بچے کے مقابلہ میں سلطنت اور وطن سب کو ہیچ سمجھ رہی تھی۔

شہنشاہ بیگم کے اس قدر صدمہ سے اس وقت ایک انگریز

لیڈی نے کہا کلیجہ پر چوٹ لگتی ہے۔ یہ خاتون ہمدردی کے الفاظ کہہ رہی تھی کہ دفعتہً بیگم نے اس کی طرف دیکھا اور حسرت سے کہا:۔

"آپ دیکھتی ہیں مجھ پر کیا گذر گئی"

چار بجے کا سین نہایت دردناک تھا۔ جب یہ انقلاب زمانہ کی تصویر دونوں میاں بیوی طہران سے روانہ ہوئے۔ لوگ کھڑے حسرت سے دیکھ رہے تھے۔ بدنصیب بادشاہ اور مصیبت ماری بادشاہ بیگم گاڑی میں بیٹھے سلطنت کو خدا حافظ کہا اور ادگند ہ سے رخصت ہوئے۔

عصمت ۱۹۰۹ء

ایک ترکی پھوپھی کا خط

پُرانے زمانہ کی مثل ہے "لاج سجنوں کی بیٹیاں جو رکھیں پنچوں کی لاج" مطلب یہ ہے کہ شریف بیٹیاں کتنی ہی مصیبت کا پہاڑ اُن پر ٹوٹ پڑے کیسی ہی آفات و تکلیف میں گرفتار ہو جائیں مگر اُن کا جوہرِ شرافت زائل نہ ہوگا فاقے کریں، پیوند لگائیں، محنت کریں، مزدوری کریں، مگر باپ دادا کی عزت، بڑوں کی آبرو، پنچوں کی لاج پر حرف نہ آنے دیں۔ مال و متاع غارت ہو، کلیجے کے ٹکڑے ہمیشہ کو چھوٹیں، وہ خود پیوندِ زمین ہوں، آنکھوں کے کلیجے ٹھنڈک۔ مگر بڑوں کی ناک، ملک کی آبرو، قوم کے وقار میں فرق نہ آنے۔

اسلامی تاریخ ان بہادر بیویوں سے بھری پڑی ہے۔ اور جب تک دُنیا اور دُنیا میں کھرا کھوٹا پرکھنے والے جوہری موجود ہیں ان عفت و عصمت کی پُتلیوں اور قوم کی فدائی دیویوں کے نام پر درود پڑھ رہے ہیں۔ گو یہ گوہرِ آبدار خاک میں مل گئے اور موت نے اُن پھولوں کو مُرجھا دیا مگر تاریخی صبا نے آج بھی اُن کی خوشبو سے دُنیا کو معطر کر رکھا ہے۔ قادسیہ کی مشہور لڑائی میں جس وقت مسلمانوں کی طاقت کمزور ہو گئی ہے اُس وقت ایک عورت خنساء جو اِس معرکہ میں شریک تھی اپنے چار بیٹوں سے اِس طرح خطاب کرتی ہے :-

"پیارے بچو! نہ تم اپنے ملک کو دوبھر تھے نہ تم پر یہ کال پڑا تھا مگر تم اپنی
بڑھیا ماں کو یہاں لائے اور فارس کے آگے ڈال دیا۔ خدا شاہد ہے!
جس طرح تم ایک ماں کی اولاد ہو اسی طرح ایک باپ کے۔ میں نے
نہ تمہارے باپ سے بددیانتی کی اور نہ تمہارے ماموں کو رسوا کیا۔
جاؤ لڑو اور آخر تک لڑو"

جنگ قادسیہ کو آج سینکڑوں برس ہو گئے خنساء کی ہڈیاں بھی گل کر خاک ہو گئیں مگر اس کی شرافت کا جوہر آج بھی اسی آب و تاب سے چمک رہا ہے تازہ واقعات اس کا پتہ دے رہے ہیں کہ کئی نسلوں کے بعد جا کر بھی وہ جوہر آجتک خواتین عرب کی طبیعت سے جدا نہیں ہوا۔ المؤید نے ایک خاتون کا خط نقل کیا ہے جو اس بھتیجے کے خط کا جواب ہے جس نے اپنی پھوپھی کو لکھا ہو کہ گورنمنٹ مجھے بھرتی کرتی ہے اور میں بچنا چاہتا ہوں۔ خاتون موصوف جس نے بھتیجے کو بچوں کی طرح پالا ہے اس طرح جواب لکھتی ہے:۔

خط

میرے عزیز بھتیجے! تمہارا خط دیکھ کر مجھے سخت رنج ہوا۔ اس لئے کہ تم لکھتے ہو کہ ذاتی ضروریات کی وجہ سے میں فوجی ملازمت سے الگ رہنا پسند کرتا ہوں مجھے تمہارا یہ بہانہ اچھا نہ معلوم ہوا۔ خیر تم گورنمنٹ کو لکھو اگر تمہاری مجبوری منظور ہو جائے تو بہتر ورنہ فوج میں بھرتی ہو۔ شریف وہ ہے جو وطن کے واسطے جوہر شرافت کو کام میں لائے۔ سلطنت کو اپنا خاندان سمجھو اور ملک کو اپنا گھر خیال کرو۔ اگر کوئی دشمن تمہارے خاندان اور گھر پر حملہ کر کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو ذلیل کرے اور تم چپکے بیٹھے رہو تو لوگ تمہیں کیا کہیں گے!

اگر تم کو کبھی میدانِ جنگ میں جانے کا اتفاق ہو تو میری یہ بات یاد رکھنا کہ

یہ اندیشہ اُس اندیشہ سے کم ہو گا جو پہلی حکومت کے زمانہ میں تمہارے ملک پر مسلط رہا تھا۔ مقابلہ میں اگر خدانخواستہ کوئی حادثہ پیش آتے اور تم کام آ جاؤ تو یہ شریفانہ موت ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی سے بہتر ہے۔ اب میں تمہیں اُن اولوالعزم جری بہادروں کی یاد دلاتی ہوں جنہوں نے ہنسی خوشی وطن پر اپنی جانیں قربان کر دیں اور محض ہمارے آرام اور ہماری آزادی کی خاطر ہمیشہ کو جا سوئے۔ یہ شریف روحیں اور پاک خون اگر نہ ہوتے تو آج آزادی و انصاف ہم کس طرح فائدہ اُٹھاتے میرے پیارے بھتیجے کیا تمہارے گھر کی طرح ان مرنے والوں کے گھر اور تمہاری بیوی بچوں کی طرح اُن کے بیوی بچے نہ تھے۔ تمہاری طرح اُن کے بھی ماں باپ تھے۔ اُن کے پہلو میں بھی دل تھا۔ مگر وہ اپنے فرض کو سمجھتے تھے اس طرف متوجہ ہوئے اور وطن پر قربان ہو کر دوامی عزت کا ایسا سہرا اپنے سر باندھا جس کے پھول قیامت تک نہ مرجھائیں گے۔ اگر قانون تمہارا عذر نہ مانے تو بہانہ نہ کرنا ورنہ میں تم سے خوش نہ ہوں گی۔

عصمت سنہ ۱۹۱۰ء

ادھم پاشا

آج مخزن کو اس شجاع وجری فیلڈ مارشل کی تصویر شائع کرنے کا فخر ہے جس کی ہمت و مردانگی نے نہ صرف فریقِ مخالف ہی کے چھکے چھڑا دیے بلکہ ایک عالم سے اپنی تدبیر و بہادری کی داد لے لی۔ غازی ادھم پاشا مرحوم کی تصویر دیکھیے صورت سے استقلال ٹپک رہا ہے اور خد و خال اس جوش دلاوری کا پتہ دے رہے ہیں جس نے یونان کی زبردست لڑائی میں فتح کا سہرا اس بہادر کے سر پر باندھا۔

۹۷؁ کی مشہور لڑائی کے وقت جو روس و روم میں ہوئی اور جس میں ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا اپنے ملک و قوم پر قربان ہو گئے۔ پاشائے مرحوم ایک برگید کے جنرل تھے۔ ۱۸ ستمبر کو فوج کا ایک دستہ لے کر اکینی سے پلونا روانہ ہوئے ۲۱، ۲۲ ستمبر یہ وہ دن تھے جب اس بہادر ترک کو روسیوں کے مقابلہ میں اپنی ہمت دکھانے کا موقع ملا۔ ابھی منزلِ مقصود دور تھی غنیم نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا اور کئی ہزار فوج ادھم کے چھوٹے سے دستے پر ٹوٹ پڑی۔ ۱۰ روز کی متواتر خونریز لڑائی کا نتیجہ ادھم کی فتح تھی جس نے بہادر ترک کو ایک حصہ فوج کی کمان نذر کی اور غازی ادھم پاشا بہ حیثیت کمانڈر جنرل کے پلونا کے مقابلہ میں آیا۔

تُرکی خون رگ رگ میں دوڑ رہا تھا اور عثمانی تلوار اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔ گو اِس معرکے میں ادھم سخت زخمی ہوا مگر اس کی شجاعت کا سکّہ روسیوں کے دل پر بیٹھ گیا۔ جس روز یہ فخرِ ملک و قوم قسطنطنیہ کا دلیر تُرک پلونا پہنچا ہے ۲۴ ستمبر تھی مقابلہ شروع ہوا۔ بازارِ موت گرم تھا اور یہ شیر میدان جان پر کھیل رہا تھا۔ روسی فوج اِدھر ادھم کی دلیری اور اُس کا استقلال اُدھر اپنے عزیز رفقا کی لاشیں خون میں ڈوبی دیکھ کر کامیابی سے نا اُمید ہوئی اور اس کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا کہ دامِ مکر پھیلا کر اِس شیر کی طاقت کمزور کر دیں۔ ادھم کا جوش لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہا تھا۔ دفعتہً روسی فوج نے کہا لڑائی بند کیجئے "عثمان پاشا نے علمِ صلح بلند کر دیا"

ناممکن تھا کہ ادھم اپنے کمانڈنگ آفیسر کے متعلق یہ اطلاع پا کر لڑائی ختم نہ کر دیتا اب یہ فیصلہ مہذب دنیا کے اِنصاف پر ہے کہ وہ اُس کو ادھم کی غلطی پر محمول کرتے ہیں یا اِسلام کی اس سچی تلقین پر جو اس کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے تھی اور جس نے مکر و ریا سے ایسے نیک نفس بندوں کو ہزاروں کوس دور کر دیا تھا۔

لڑائی ختم ہو گئی مگر معزول عبدالحمید کی نگاہ نے اپنے جواہرات پرکھ لئے۔ اور ایک روز ایسا آیا کہ یونان کے مقابلہ میں ادھم پاشا مرحوم فیلڈ مارشل تھا۔

گو روسیوں کے دھوکے میں آ کر ادھم پاشا نے میدانِ جنگ میں ہاتھ روک لیا۔ لیکن جس وقت یہ راز افشا ہوا تو ادھم کے غیض و غضب کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ تیغ عثمانی اُسی روز سے منتظر تھی کہ کب نیام سے باہر نکلے۔ یونانیوں سے جنگ کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی تھی کہ برسوں کے حوصلے اور

مدتوں کی خواہش پوری ہونے کا وقت آگیا جوں جوں لڑائی کی خبر گرم ہوتی جاتی تھی غازی کا خون جلووں بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ یکم اپریل ۹۷ء کو بیس سال کی دبی ہوئی آگ میں شعلے بھڑک اٹھے اور اعلان جنگ کے ساتھ ہی ادھم پاشا قسطنطنیہ سے روانہ ہوا گو اس وقت تمام یورپ ٹرکی کا مضحکہ اڑا رہا تھا اور سچ یہ ہے کہ مضحکہ کچھ بیجا بھی نہ تھا۔ بیس ہزار فوج یونانی جم غفیر کے مقابلہ میں کیا کر سکتی تھی۔ مگر بڈھا مدبر تجربہ کار عبد الحمید اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہی فقیر جن پر آج دنیا ہنس رہی ہے۔ بڑے بڑے امیروں اور اچھے شہزوروں کو خون کے آنسو رلوا دیں گے۔

ابھی سپاہیوں کے ٹھٹھے ختم بھی نہ ہوئے تھے کہ ترکی شیر میدان جنگ میں پہنچا۔ یونانیوں نے بھی اس موقع پر ہاتھ پاؤں لڑا دیا۔ دل کے دل گرد و نواح سے امنڈ آئے مگر بیس برس کی میان کی ہوئی تلوار ایک آفت ناگہانی تھی جس نے دشمن کے دریا بہا دیئے اور دفعتہً کانوں میں یہ صدا پہنچی کہ ادھم پاشا نے ۲۳ اپریل کو ترناوا میں اور ۲۵ کو اورسا پر قبضہ کر لیا اور وہ یونانی جو تمام غفلت میں چور اس امید پر نکلے تھے کہ قسطنطنیہ میں ہمارا پھریرا اڑے گا تھسلی کو بھی ادھم کی نذر کر گئے۔

ابھی تو ان واقعات کو تیرہ چودہ ہی برس گذرے ہیں۔ مگر نہیں جب تک تھسلی روئے زمین پر موجود ہے اس کا چپہ چپہ ترکی سپہ سالار غازی ادھم پاشا کی شجاعت کے گیت گائے گا۔

پاشائے مرحوم فرہاد آفندی کے ہاں جو دربار سلطانی میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے ۱۸۳۸ء میں پیدا ہوا۔ قسطنطنیہ کے جنگی مدرسہ میں تحصیل علم کی اور فارغ التحصیل ہو کر ریذیڈنٹ کونسل حربیہ کا

اٹڈ یکانگ مقرر ہوا اور یہاں سے ترقی کرتا ہوا اکار و سلطانی میں پہونچا۔ روس کے برخلاف جو شجاعت ظاہر کی تھی وہ بیکار نہ گئی اور قدردان سلطان نے محکمہ عسکریت شاہ استاد کی کمان عطا فرمائی۔ ان تمام فرائض کو کچھ ایسی اچھی طرح انجام دیا کہ چند ہی روز بعد کسا دیٹ کا گورنر یہی بہادر ترک تھا اور بالآخر یونان کے مقابلہ میں تمام سلطانی فوج کا سپہ سالار۔

باوجود اس دلیری اور ہمت کے مزاج میں حد سے زیادہ رحم تھا۔ مظلوم کی مدد بے بسوں اور بے کسوں کی اعانت اور پھر یہی نہیں کہ اپنے ہوں۔ نہیں دوست ہوں یا دشمن ادھم پاشا کا خاص شیوہ تھی۔ یہاں تک کہ جانی دشمن اور خون کے پیاسے بھی اگر وقت پڑے پر عفو ادھمی کے طلب گار ہوتے تو ادھم کا دل ان کی تکلیف گوارا نہ کر سکتا۔ زینون میں جس وقت وہ سنگ دل ارمنی جنہوں نے تقریباً پانچ سو ترکوں کو قتل کر دیا تھا اسیر ہو کر سامنے آئے اور باوجود اس عداوتِ قلبی کے اُنہوں نے عفو کی درخواست کی تو پاشائے موصوف سے اُن کی تکلیف و مصیبت نہ دیکھی گئی اور اُن کے قصور سے درگذر کی۔

اس اعزاز پر بھی جو قسطنطنیہ نے اُسے بخشا عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ ادھم پاشا سے زیادہ محنتی، جفا آدمی مشکل سے ہو گا۔ ایک عیسائی تجربہ کار شخص کا بیان ہے "میں نے اُسے رات کے دو دو تین تین بجے اور صبح کے پانچ پانچ بجے اپنے فرائض کی ادائیگی میں مصروف پایا ہے" مسٹر مانٹگمری فرماتے ہیں "جب نصیب پاشا ویسٹنو کے فتح کرنے میں ناکام رہا تو غازی ادھم پاشا کی خدمت میں اطلاع دینے کے واسطے روانہ ہوا۔ اس وقت آدھی رات گذر چکی تھی میں ٹھیک

ایک بجے خدمتِ اقدس میں پہونچا اور مفصل کیفیت بیان کی۔ پاشائے موصوف نہایت اطمینان سے میری گفتگو سنتا رہا۔ چہرہ پر کسی قسم کی گھبراہٹ کے آثار یا پریشانی نہ تھی۔ نقشہ ہاتھ میں تھا۔ مجھ سے سوال کرتا جاتا تھا اور نقشہ کو بغور ملاحظہ۔ جب گفتگو ختم ہو چکی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت تقریباً دو بجے ہوں گے۔ صبح کے وقت اٹھا تو آفتاب نہ نکلا تھا دیکھتا کیا ہوں بارہ ہزار فوج کا پورا دستہ نعیم کی مدد کو چلا جا رہا ہے"

پاشائے مرحوم میں بڑی تعریف کی بات یہ تھی کہ کبھی اپنی فتوحات یا شجاعت پر گھمنڈ نہ کیا۔ نہایت منکسر المزاج اور حد درجے کا عبادت گذار۔

الحق کہ وہ عثمانی شرفا کا بہترین نمونہ تھا اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک نامہ نگار کے ان الفاظ کا یقین نہ کریں "ایڈہم رحیم کم سخن صادق الاقرار غرض وہ تھا جس کا ہر شخص شیدا اور ثنا خواں رہا"

حیاتِ مستعار کا لازمی نتیجہ موت جس نے ادھم جیسے لاکھوں اور کروڑوں کو ہمیشہ کے واسطے سلا دیا۔ آخر اس جری ترک کو بھی آبادی سے جنگل میں لے گئی اور وہ شخص جو رات کو بھی بمشکل سوتا تھا اب ہمیشہ کے واسطے آرام کر رہا ہے۔ اور جس شخص کو دم بھر لیٹنے کی بھی فرصت نہ تھی آج مٹی اس کو تھپک تھپک کر سلا رہی ہے۔

وہ دماغ جو پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں آناً فاناً سلجھا لیتا تھا آج معطل۔ وہ ہاتھ جو میدانِ کارزار میں اپنی بہادری دکھاتے تھے آج بیکار۔ وہ آنکھیں جو موقعہ جنگ پر چاروں طرف دیکھ بھال رکھتی تھیں آج بے نور۔ المختصر وہ ادھم پاشا جس کی جرأت و ہمت کا لوہا ایک دنیا مانے ہوئے تھی آج مردہ پڑا ہے۔

یوں تو ہر صاحبِ انصاف پاشائے مرحوم کی موت پر افسوس کرے گا مگر اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ ادھم کی موت ٹرکی کو ایسا نقصان پہنچا گئی جس کی تلافی آسان نہیں۔

فخر ان ۹ سنہ ء

داستان پاریده



اسپین میں مسلمانوں کی آخری گھڑیاں

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ آج وہ ملک اسپین، جس میں نام کو مسلمان نہیں آٹھ سو برس تک نہ صرف مسلمانوں کی حکومت میں رہ چکا ہے بلکہ یہاں مسلمانوں کے وہ وہ دور دورے ہوئے ہیں کہ ان کی کیفیت سن کر بے اختیار خدا کی قدرت یاد آجاتی ہے جس وقت مسلمان سپین کے بادشاہ تھے اور اسلامی جھنڈا چاروں طرف اُڑ رہا تھا۔ ذرّے ذرّے سے صدائے اللہ اکبر بلند ہو رہی تھی اس وقت دار الخلافہ قرطبہ تھا۔ اور یہ وہی قرطبہ تھا اور وہی قرطبہ ہے جس کے واسطے مولانا حالی فرماتے ہیں۔

"کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے"

قرطبہ مسلمانوں کے عہد میں کیا تھا، اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا، وہ ہر اعتبار سے بے مثل تھا، دنیا بھر کے اہل کمال موجود تھے عالیشان محل خوشنما باغ اپنا جواب نہ رکھتے تھے، غرض قرطبہ ملکوں کی دلہن تھا، جس میں ہر روز عید اور ہر رات شب برات بنا رہتا تھا، مگر جب وہ وقت آیا ہے کہ مسلمان سپین میں اپنا دم توڑ رہے تھے حسد اور عداوت کی باہمی آگ مسلمانوں میں بھڑک رہی تھی، ایک دوسرے کی جان کا دشمن تھا۔

اور جس طاقت سے دشمنوں کے چھکے چھڑا دیے تھے وہ منتشر ہوچکی تھی۔ اور دو حکومتیں قائم تھیں۔ تاریخ چیخ چیخ کر پکار رہی ہے کہ مسلمان ہمیشہ اس آگ میں اس طرح فنا ہوئے ہیں کہ اُن کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ صرف تھوڑا سا خاکستر مرثیہ پڑھنے کو باقی رہ گیا ہے۔ اس وقت سپین کی یہی کیفیت تھی کہ دشمنوں نے اس نفاق و عداوت سے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اور شاہ کیسٹل نے دونوں کو لڑوا کر اتنا کمزور کیا کہ خاک بھی نہ رہا۔ اب محمد ابو عبد اللہ الزقیر مسلمان حکمران تھا جس کا دارالخلافہ غرناطہ تھا۔ شاہ کیسٹل کو اب زیادہ صبر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ عبد اللہ بساط غرناطہ پر شطرنج کا بادشاہ تھا اور اس لئے کہ اسلامی حکومت کا خاتمہ تاریخ میں اسی کے نام پر لکھا تھا۔ اکثر رویا کرتا تھا اور پچھتاتا تھا۔ ۸۹۵ھ ہجری میں عبد اللہ کو پورا یقین ہوگیا کہ کیسٹل جلد حملہ کرکے اُس کا خاتمہ کردیگا۔ اس یقین کے بعد ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ کیا کرے کہ کیسٹل نے حملہ کیا اور غرناطہ کا محاصرہ کرلیا۔

قصر حمرا میں جس کے کنگورے آسمان سے باتیں کرتے تھے جس کے نقش و نگار نمونۂ جنت تھے، عبد اللہ نے چیدہ چیدہ سردار جمع کئے اور مشورت کی اور ایک ایسی تقریر کی جس کو پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ لوگ مقابلہ کے لئے تیار ہوئے، فوجوں نے بھی آمادگی ظاہر کی مگر دشمن کی طاقت بہت زیادہ تھی۔ اور یہاں جو تھی بھی وہ یہاں نفاق و عداوت میں رنگی ہوئی۔ البتہ ایک شخص اس وقت سپین میں ایسا موجود تھا جس پر مسلمان فخر کرسکتے ہیں۔ یہ موسےٰ غانی تھا۔ اس نے جانبازی سے غرناطہ کی حفاظت کی سپین اس کو فراموش نہیں کرسکتا۔

وہ روزانہ باہر نکل کر مقابلہ کرتا اور اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتا اور حقیقت یہ ہے کہ اُس نے اپنی ہمت و مردانگی سے کیسٹل کا منہ پھیر دیا، لیکن اس کی فوج بہت زیادہ تھی، بہادر مسلمان کثرت سے کام آتے، موسیٰ اکثر موقعوں پہ تنہا تلوار لے کر دشمن کے لشکر پر جا پڑا اور بیسیوں سر اڑا کر واپس آیا۔ موسیٰ کی یہ ہمت دیکھ کر مسلمانوں کے دل اور بڑھے، اور انہوں نے ثابت کر دیا کہ اس گئے گزرے وقت میں بھی وہ حلوائے بے دود نہیں ہیں۔ ایک دفعہ موسیٰ نے محاصرہ توڑ دیا اور یہ وہ نازک وقت تھا کہ خود کیسٹل اور اُس کی فوج محاصرہ میں آگئی، لیکن تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ دوسرے روز پھر غرناطہ محاصرہ میں آگیا۔

لڑائی کا یہ رنگ دیکھ کر ایک روز نمازِ صبح کے بعد موسیٰ نے فیصلہ کن حملہ کیا اور دشمن پر جا پڑا، سواروں کا حملہ اس قدر سخت تھا کہ موسیٰ کو فتح کا کامل یقین ہو گیا، مگر بہادروں نے ہمت ہار دی اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ دشمن نے غرناطہ کی فصیل تک تعاقب کیا اور مجبور شہر میں آکر پناہ لینی پڑی۔ موسیٰ اس ناکامی سے آپے سے باہر ہو گیا۔ غصہ میں تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بڑی ناکامی اس کو یہ ہوئی کہ خود عبد اللہ کی ہمت ٹوٹ گئی اور وہ صلح پر طیار ہو گیا، اور ابو القاسم وزیر کو صلح کے واسطے روانہ کیا۔ دشمن نے من مانی شرائط پر صلح کی جس وقت ابو القاسم نے شرائط پڑھ کر اپنے آدمیوں کو سنائیں تو موسیٰ کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک ایسی تقریر کی کہ پتھر بھی موم ہو جاتا، مگر مسلمانوں پر مطلق اثر نہ ہوا، موسیٰ اس کے بعد روتا ہوا قصر حمرا سے نکلا، اور پھر کسی نے اس کی صورت نہ دیکھی۔

صبح کا وقت مقرر ہو کہ کیسٹل غرناطہ میں داخل ہوا، اور عبداللہ وہاں سے مع فوج کے رخصت ہوا۔ آخر وہ منحوس گھڑی آئی اور آج غرناطہ کی مسجد میں یہ آخری اذان تھی، ابھی نماز ختم نہ ہوئی تھی کہ باجوں کی آواز نے کیسٹل کے داخلہ کا اعلان کیا۔

ابو عبداللہ گھوڑے پر سوار استقبال کو تیار تھا، جس وقت کیسٹل قریب پہنچا تو عبداللہ نے گھوڑے سے اترنے کا قصد کیا، کیسٹل نے اُسے روکا، عبداللہ نے اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور کہا۔

"اے طاقت ور بادشاہ! خدا یہ سلطنت تجھے نصیب کرے، یہ اسی کی مرضی ہے کہ ہم اس کے حکم کے موافق اس کو تیرے سپرد کرتے ہیں"۔

عبداللہ اس کے بعد الغشاسا چلا گیا، جو کچھ حصہ سلطنت کا باقی رہ گیا تھا وہ بھی کیسٹل کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

جس وقت عبداللہ رخصت ہو رہا تھا وہ عجیب سماں تھا۔ اسپین کے در و دیوار حسرت سے روتے تھے، اور خدائے برتر کا یہ فیصلہ اپنی صداقت ثابت کر رہا تھا کہ

"ہم کسی قوم کی حالت نہیں بدلتے جب تک وہ خود نہ بدلے"

عصمت ۱۹۲۲ء

جودھا بائی

چندر بنسی خاندان کی اس راجکماری کا کوارپنہ جو قصر جہانگیری میں دلہن کی حیثیت سے داخل ہوئی باوجود کوشش کے مطلق نہ معلوم ہو سکا، اور اگر یہ صحیح ہو کہ ملکہ جودھا بائی کے میکے کے حالات کا پتہ نہیں تو ہندو تاریخ اسکی ذمہ دار ہوگی، کیونکہ خاندانِ مغلیہ میں داخل ہونے کے بعد سے موت تک کی پوری زندگی مسلم تاریخ میں موجود ہے۔

فرماں روایانِ ہند میں اکبر وہ پہلا بادشاہ ہے جس نے استحکام سلطنت کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد پر رکھی، اور اس بنیاد پر اپنا اعزاز و اکرام قربان کر دیا، یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ مسلمانوں نے تلوار کے زور سے شادیاں کیں، مگر یہ دیکھنا ذرا مشکل ہے کہ

دُلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر جو لائے تھے
وہ شاہنشاہ اکبر اور جہانگیر ابن اکبر تھا

جودھا بائی کی شادی جو شاہنشاہ اکبر کے نورِ نظر شہزادہ جہانگیر سے ہوئی مورخین کی رائے یہ ہے۔

قرابت راجگان ہند سے اکبر نے جب چاہی ۔۔۔ کہ یہ رشتہ عروسِ کشور آرائی کا زیور تھا
تو خود فرمانروا جے پور نے نسبت کی خواہش کی ۔۔۔ اگرچہ آپ بھی وہ صاحبِ دیہیم و افسر تھا

دورِ حاضرہ کی رفتار یہ دعویٰ باآسانی ثابت کر رہی ہے کہ حکومت کی

معاشرت اور تمدن وغیرہ کا اثر رعیت پر کس حد تک پڑتا ہے، یہاں تک کہ مذہبیت بھی حکومت کے مذہب میں جذب ہو جاتی ہے، اس کی زندہ مثالیں اس وقت بھی ہندوستانی ریاستوں میں موجود ہیں۔

شہنشاہ اکبر چونکہ خود پہل کر چکا تھا، اس لئے شہزادہ کے واسطے اس کا قصد ظاہر ہونے کی دیر تھی، راجکماری جودھابائی سے نسبت قرار پائی، ہم کو اس بحث کی ضرورت نہیں کہ راجکماری کے باپ والی جودھپور نے خود خواہش کی یا شہنشاہ کی تجویز سے اتفاق کیا۔ بہر حال ۱۵۸۵ء میں یہ شادی اس دھوم دھام سے ہوئی کہ اس کا غلغلہ زمین سے آسمان تک بلند ہو گیا۔

تاریخ ہم کو یہ بتا رہی ہے کہ ہندو راجکماریوں نے عین سوئمبر کے وقت شادی سے انکار کر دیا ہے، اور اس لئے ہمارا یہ قیاس غلط نہیں ہو سکتا کہ اس شادی سے فریقین شاداں و فرحاں تھے۔

رانی جودھابائی خاندان راٹھور کی راجکماری مہاراجہ مالدیو کی پوتی اور والئ جودھپور کی لڑکی تھی۔ یہ خیال کہ جودھابائی اکبر کی بیوی تھی جیسا کہ ہندو تاریخ بتاتی ہے یقیناً غلط ہے۔ اکبر کی رانی راجہ بھادر مل والئ جے پور کی راجکماری تھیں۔

جس وقت یہ ہونہار راجکماری جودھپور کے محلوں میں تربیت پا رہی ہو گی اس وقت کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ ہو گا کہ یہ وہ اقبال مند ملکہ ہے جس کی شادی کا ڈولہ اکبر اور جہانگیر جیسے جلیل القدر بادشاہوں کے کندھوں پر ہو گا۔ اور شہنشاہ اکبر اس کا اس قدر احترام کرے گا کہ خدا کی عبادت کے بعد سب سے پہلے بہو کے درشن کرے گا۔ جودھپور کے ریگستان جہاں شب و روز خاک اڑتی تھی راجکماری کی شادی کے وقت گلزار ارم بن گئے، کوسوں تک

دیبا و حریر کا فرش ہوا، قاقم و سنجاف کے بچھونے ہوئے اور دولہا دولہن کے پھیروں کے واسطے راجہ کے محل میں ایک ایسا منڈھا چھوایا گیا جہاں گُندھے ہوئے خوشبودار پھول رستہ چلنتوں کے دماغ معطر کر رہے تھے۔ منڈھے کا عکس سونے کا اور بانس چاندی کے تھے، اور جس جگہ دولہا دلہن بیٹھے رسمیں ادا کر رہے تھے وہاں ہیرے اور موتی کی جھالریں جگمگا رہی تھیں۔

جنگل میں منگل ہو رہا تھا، اور جب وہ مبارک اور سعید گھڑی آئی کہ راجکماری جودھا بائی پالکی میں سوار ہوئی تو ایک عجیب منظر تھا۔

دولہا کے دُلہن کو گود میں اُٹھانے کی، دولہن کی وداع کے وقت منڈھا گانے کی اور سمدھنوں کو گالیاں یعنی سیٹھنیاں دینے کی رسم یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ جب راجکماری کی وداع کا وقت آیا تو راجہ نے بادشاہ کی خدمت میں پیام بھیجا کہ منڈھے میں تشریف لائیں تاکہ میں راجکماری کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ہاتھ میں دوں۔ یہ وہ وقت تھا کہ راجہ کی آنکھ سے آنسو رواں تھے۔ اکبر خود بھی رقیق القلب آدمی تھا، اِدھر تو منڈھے کے الفاظ سے متاثر ہوا اُدھر راجہ کی درخواست سے، جودھا بائی کو گلے سے لگا لیا، شہزادہ دست بستہ دولہا بنے کھڑا تھا۔ اس کی طرف دیکھا اور حکم دیا کہ گود میں اُٹھا لے۔ حکم کی تعمیل فوراً ہوئی، باہر ڈولہ یعنی پالکی موجود تھی، دولہا نے دلہن کو لے کر پالکی میں بٹھا دیا، دور و یہ فوج دست بستہ حاضر تھی، شادیانے بج رہے تھے کہ راجہ نے آگے بڑھ کر شہنشاہ کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور خاموش کھڑا ہو گیا، اکبر نے سمدھی کے سر پہ ہاتھ رکھا اور شہزادہ کو حکم دیا کہ دلہن کی پالکی اپنے کندھے پر اُٹھا لے۔ اِدھر شہزادہ نے پالکی اُٹھائی اُدھر بادشاہ نے آگے بڑھ کر آب دار اپنے کندھے پر رکھا۔ اِس عزت افزائی کا اثر راجہ کے دل پر اس قدر ہوا کہ بیتاب ہو گیا۔

سب کیا تھا سینکڑوں امراء و سردار نے عجز کے کندھے رانی کے روبرو جھکائے، اور اس طرح یہ با اقبال ملکہ قصر جہانگیری میں داخل ہوئی۔

رانی جودھا بائی حسن، سلیقہ، فہم و فراست، ہر اعتبار سے قابلِ ستائش تھی، اور نور جہاں جیسی ہوشیار بیگم کے مقابلہ میں کبھی زیر نہ ہونا اسی کا کام تھا۔ اس کی حاضر جوابی، لیاقت اور عقلمندی مشہور ہے، ایک موقعہ پر جہانگیر نے کہا، نور جہاں کہتی ہے "جہاں پناہ آپ کے منہ میں سے ہمیشہ خوشبو آتی ہے، جودھا بائی تم بتاؤ یہ کہاں تک صحیح ہے"

اس سوال کا جواب آسان نہ تھا، بالخصوص ایسی حالت میں کہ رقابت موجود ہو، سیدھی سی بات تو یہ تھی کہ جودھا بائی نہ صرف اس خیال کی تائید کر دیتی بلکہ خوشبو میں مشک و عنبر کا اور اضافہ کر دیتی، مگر جودھا بائی کی فراست اس کی مقتضی نہ تھی، اس نے مسکرا کر عرض کیا "جہاں پناہ خوشبو کا امتیاز اس کو ہو سکتا ہے جس نے بدبو سونگھی ہو، مجھے کیا معلوم مردوں کے منہ سے کیسی خوشبو آتی ہے"

یہ درحقیقت نور جہاں کے سابق شوہر شیر افگن کی طرف اشارہ تھا۔

رانی جودھا بائی آخر وقت تک شوہر کی انتہائی رفیق و غمخوار اور فرماں بردار ثابت ہوئی۔

تاریخ کہتی ہے کہ اس نے اسلام قبول کر لیا تھا، ہم کو اس سے بحث نہیں مگر اس خوش نصیبی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ شاہجہان جیسا عالی مرتبہ شہنشاہ اس کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

اکبر بادشاہ نے اس جلیل القدر بہو کا ہمیشہ اس قدر احترام کیا کہ سوا پہر دن چڑھے تک بھی اس وقت تک جب تک وہ جھروکوں میں بیٹھ کر سورج کے درشن کرتی، لاکھوں روپیہ خیرات کیا کرتی تھی اور یہ سب روپیہ خزانہ شاہی سے ادا ہوتا۔ وفات ۱۰۳۲ھ

پاروتی

وہ گروہ جس کی غفلت اس حد تک پہونچ چکی ہو کہ اپنے اسلاف کے کارنامے بھی بھول چکا ہو اس سے ترقی کی توقع مشکل سے بار آور ہو سکتی ہے۔ خواتین ہندوستان اگر محض اپنے ہی طبقہ پر نظر ڈالیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ سرزمین ہندوستان سے ایسی ایسی عورتیں پیدا ہوئی ہیں کہ ایک ہندوستان کیا دنیا ان پر ناز کر سکتی ہے۔ یہ قابل فخر خاتون پاروتی جس کا نام زیب عنوان ہے کان پور کے ایک معمولی برہمن کی لڑکی تھی، مگر قدرت نے کچھ ایسی خوبیاں اس میں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھیں کہ کوارپنے ہی میں تمام گاؤں اس کے خلق و محبت کا گرویدہ تھا۔ پاروتی کی ماں اس کو چھوٹا ہی سا چھوڑ کر مر گئی تھی، باپ نے جس محبت اور توجہ سے بچی کی پرورش اور تربیت پر توجہ کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاروتی نے ہوشیار ہوتے ہی نہ صرف اپنے باپ کی خدمت اپنا فرض سمجھی بلکہ قرب وجوار کے تمام آدمی اس کی بے لوث خدمات سے مستفید ہوئے۔ اسکی عمر ابھی گیارہ ہی سال کی تھی کہ گاؤں کے اکثر مریض اور زخمی اس کی نیک نیتی کا کلمہ پڑھنے لگے وہ ہر حاجتمند کی مدد اپنا فرض سمجھتی تھی، یہاں تک کہ اس کی قابلیت کا شہرہ دور دور ہو گیا۔ اس زمانہ کے رسم و رواج کے موافق لڑکیاں کم عمری ہی میں بیاہ دی جاتی تھیں۔ پاروتی کی شادی بھی قنوج کے ایک برہمن کام دیو سے ہو گئی، لیکن وہ عجیب منظر تھا جب یہ ہونہار لڑکی اپنے

دیس کو ہمیشہ کے واسطے چھوڑ کر شوہر کا گھر بسا رہی تھی، بڈھا باپ صدمہ کے انتہائی اثر سے خاموش تھا اور گاؤں کے بے شمار آنسو پاروتی کی وداع میں شریک تھے۔

پاروتی گاؤں پہونچی تو گو اُس کا فرض اولین شوہر کی اطاعت تھا، مگر برہمنوں کی بیکاری اور دوسروں کی کمائی پر بسر اوقات اُس کو اچھی نہ معلوم ہوئی مگر اس معاملہ میں لب کشائی پاروتی کے واسطے آسان کام نہ تھا۔ اول تو مدتوں کی عادت، دوسرے دولت کا معاملہ اور سب سے زیادہ یہ کہ بزرگوں کے سامنے ایک معمولی لڑکی اور وہ بھی بہو حقیقت ہی کیا رکھتی تھی۔

کئی سال اس طرح گذر گئے اور اس عرصہ میں پاروتی نے اپنی خوبی سے وہ خدمات انجام دیں کہ قنوجی برہمن خوش ہوکر اس کو نازبرہمنی پکارنے لگے۔ پاروتی اپنے وقت کا بڑا حصہ شوہر کی خدمت میں بسر کرتی مگر جو کانٹا اُس کے دل میں کھٹک رہا تھا اُس کے نکلنے کا وقت نہ آتا۔ ایک روز بسنت پنچمی کی پوجا سے فارغ ہوکر کام دیو کے دل میں بیوی کی خدمات کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اُس نے اپنے ہاتھ سے چندن کا ٹیکا اس کے ماتھے پر لگا دیا۔ پاروتی اس عنایت اور محبت کے جواب میں شوہر کے قدموں پر گر پڑی۔ کام دیو نے پاروتی کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی، اس موقعہ پر پاروتی کا جی بھر آیا، اُس نے شوہر کے قدموں پر ہاتھ لگایا اور کہنے لگی "کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔"

کام دیو نے تعجب سے جواب دیا "ہاں ہاں ضرور ضرور" پاروتی عاجزی سے کہنے لگی "ہم برہمن ہیں اور جس طرح دُنیا میں ہر شخص اپنی قوت سے روزی پیدا کرتا ہے اسی طرح ہم کو بھی کرنی چاہیئے۔ پرائے ٹکڑوں پر زندہ رہنا انصاف سے بعید ہے۔ کہنے کو برہمن کتنے ہی معزز کیوں نہ ہوں لیکن

ان کا یہ فعل حقیقتاً جائز نہیں۔ خیرات کے اصلی مستحق وہ لوگ ہیں جو اپنی محنت سے روزی کمانے کے قابل نہیں۔" پاروتی کی یہ گفتگو وہ تھی جو اس سے پہلے کام دیو کے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی، اُس نے حیرت سے پاروتی کا منہ دیکھا اور کہا "برہمنوں کے واسطے یہ سب جائز ہے اور اس میں کوئی قباحت نہیں۔" پاروتی نے کہا "اگر اس لئے جائز ہے کہ یہ رسم جاری رہے تو آپ خود غور کیجئے کہ یہ رسم قابلِ اصلاح ہے یا نہیں، یہی روپیہ جو ہٹے کٹے آدمیوں کے پیٹ میں جا رہا ہے اگر اپاہجوں کو دیا جائے یا بچوں کی تعلیم پر خرچ ہو تو کس قدر اچھا ہو۔" کام دیو نے کچھ سوچا اور کہا "اگر ہم خیرات کا لینا چھوڑ دیں تو گذر اوقات کیونکر ہو" پاروتی نے فوراً جواب دیا۔

"جس طرح تمام دنیا محنت مشقت کرتی ہے آپ بھی کیجئے۔ اس مشقت میں آپ کے ساتھ میں برابر کی شریک ہوں گی۔" پاروتی کی اس گفتگو کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ اُسی وقت کام دیو نے عہد کر لیا کہ آئندہ وہ خیرات کے پیسہ کو ہاتھ نہ لگائے گا۔ یہ خبر رفتہ رفتہ تمام شہر میں مشہور ہو گئی کہ کام دیو اور پاروتی دونوں محنت مشقت سے اپنا پیٹ پال رہے ہیں اور ہر قسم کی خیرات واپس کر دیتے ہیں۔ یہ راجہ جیتل سا کا دور تھا، اُس نے سُنا تو فوراً کام دیو کو بلا بھیجا۔ جب کام دیو کو راجہ کی طلبی کا حکم پہنچا تو اُس نے پاروتی سے کہا کہ اب کیا کیا جائے۔ پاروتی نے کہا کہ آپ شوق سے جائیے، راجہ کو دعائیں دیجئے لیکن اگر وہ کچھ خیرات دے تو ہاتھ نہ لگائیے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، کام دیو راجہ کے پاس گیا، دیر تک باتیں ہوتی رہیں، ہر چند راجہ نے اصرار کیا مگر کام دیو نے اس کے روپیہ کو ہاتھ نہ لگایا اور چلا آیا۔

راجہ چند داس وقت تو خاموش رہا مگر پاروتی کے خیالات سن کر اس نے مصمم قصد کر لیا کہ کسی موقعہ پر ایسی قابل قدر عورت کی آزمایش کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ایک روز شام کے وقت فقیروں کے بھیس میں اس کے گھر پر پہونچا اور سوال کیا، پاروتی اس وقت کھانا پکا رہی تھی، کہنے لگی۔ "مہاراج ٹھیریئے میں ابھی کھانا لیکر آتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جس طرح بیٹھی تھی اسی طرح چوکے سے نکل کر کھانا لئے چلی آئی راجہ نے کہا:۔

" شریف بہو بیٹیوں کو اس طرح بے حجابانہ غیر مردوں کے سامنے آنا مناسب نہیں"۔ اتنا سنتے ہی پاروتی آگ بگولا ہو گئی اور کہنے لگی "سائل کا سوال کان میں پہونچنے کے بعد جس طرح سننے والے کا فرض ہے کہ وہ سائل کی حتی الوسع مدد کرے اسی طرح سائل کو بھی اپنے سوال کی دھن میں اتنا غرق ہو جانا چاہیئے کہ کسی دوسری چیز کا ہوش نہ رہے۔ میں یہ ہی سمجھ کر تیری مدد کو آئی مجھے معلوم نہ تھا کہ تو مکار فقیر ہے اور ابھی تیرے منہ پر آنکھیں کام کر رہی ہیں۔ راجہ بجائے غصہ کے مسکرایا اور کہا بیٹی خفا نہ ہو، میں فقیر نہیں، اس بستی کا راجہ ہوں اور فقط تیری آزمایش کو آیا تھا۔ حق یہ ہے کہ واقعی تو اس پایہ کی عورت ہے کہ راج تجھ جیسی لڑکی پر ہمیشہ فخر کرے گا"۔ یہ کہہ کر راجہ نے اپنی جھولی الٹی جس میں اشرفیاں بھری تھیں۔ پاروتی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراجہ یہ میرے کس کام کی ہیں"۔

راجہ نے کہا "تجھے اختیار ہے جہاں چاہے صرف کر دے"

پاروتی نے عرض کیا "مہاراج اس روپیہ سے پاٹ شالے یعنی بچوں کے مدرسے جاری کر دیجئے کہ خدا کی مخلوق خدا کے علم سے باخبر اور جہالت سے بچے"۔

راجہ نے آٹھ مدرسے اِس رقم سے قنوج میں جاری کئے جو عرصہ تک کام کرتے رہے اور جن سے بڑے بڑے عالم فاضل پیدا ہوئے۔

پاروتی معمولی عورت تھی مگر اس کا نام بڑی بڑی رانیوں اور بیگموں سے زیادہ روشن ہے۔

عصمت ۲۱ء

خونزہ ہمایوں

دکن کی یہ بہادر ملکہ تاریخ میں اس قدر کافی شہرت رکھتی ہے کہ اکثر آدمی اس کے نام سے واقف ہوں گے، یہ بادشاہان آذربائیجان کی اولاد سے تھی اور حسین نظام شاہ والی احمد نگر سے بیاہی گئی۔ نظام جس وقت تخت حکومت پر بیٹھا اس کی عمر تیس اور خونزہ کی چوبیس تھی۔ وہ گیارہ سال تک شوہر کے ساتھ امور مملکت میں شریک رہی اس کی رائے اکثر معاملات میں نہایت درست اور صحیح ہوتی تھی۔ حسین نظام شاہ کو ملکہ کی اس فراست پر اتنا بھروسہ ہو گیا کہ وہ برائے نام فرماں روا رہا، اور لہو و لعب میں مصروف ہو گیا۔ سلطنت کے تمام کام خونزہ انجام دیتی تھی۔ اس نے ہر چند کوشش کی کہ شوہر کو صحیح راستہ پر لائے، مگر شراب نظام کے منہ سے نہ چھوٹی، یہاں تک کہ اکتالیس برس کی عمر میں وہ دو بیٹے اور دو بیٹیاں خونزہ ہمایوں کے سپرد کر کے دنیا سے رخصت ہوا۔ خونزہ حقیقتاً بادشاہ تو پہلے ہی سے تھی۔ اب اس نے بڑے لڑکے مرتضیٰ نظام شاہ کو تخت پر بٹھایا اور خود تمام کام انجام دینے شروع کئے، بدقسمتی سے مرتضیٰ بھی باپ کی طرح ناکارہ ثابت ہوا۔ اس کو سیر و شکار کے سوا سلطنت سے مطلق واسطہ نہ تھا۔ اور اب تمام

معاملات اکیلی خونزہ پورے کررہی تھی۔ علی عادل شاہ والی بیجاپور نے یہ رنگ دیکھ کر آس پاس کی حکومتوں کو دبانا شروع کیا حتیٰ کہ ۹۷۳ھ میں نلگنڈہ پر حملہ کر دیا، وینکٹ حاکم نلگنڈہ نے خونزہ سے درخواست کی کہ نلگنڈہ آپ کے شوہر نے مجھے عنایت کیا تھا اب آپ میری مدد کیجئے۔

خونزہ جس قدر ذی فہم اور ہوشیار تھی اتنی ہی بہادر اور جان باز، فوراً ایک لشکر جرار لے کر مدد کو روانہ ہوئی اور راستہ میں تفال خاں والی برار کو اپنے ساتھ لیا اور ابراھیم قطب شاہ کو بھی اعانت کے واسطے طلب کیا۔ ابراھیم مدد کو تو پہنچا مگر اس کی خواہش یہ تھی کہ علی عادل شاہ اور خونزہ دونوں کمزور ہو جائیں، چنانچہ یہی ہوا، خونزہ کو کامل فتح نہ حاصل ہوئی اور عین موقعہ پر اپنے ہی رفیق آنکھ چرا گئے، ملکہ دانت پیس کر خاموش ہو گئی، ابراھیم نے موقعہ پاکر ادھر اُدھر خوب ہاتھ مارا اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر قبضہ کر لیا، اور خونزہ ہمسایوں کو جو اس لڑائی میں کافی نقصان اُٹھا چکی تھی، جھوٹ سچ باتیں ملا کر احمد نگر واپس کر دیا، خونزہ جس وقت پژمردہ اور نڈھال جا رہی تھی عادل شاہ نے اس پر حملہ کیا۔

یہ بھی عجیب وقت تھا، عادل شاہ نے پوری تیاریاں کر لی تھیں، خونزہ کے لشکر کا بڑا حصہ کام آچکا تھا، ذخیرۂ جنگ ختم تھا، مگر جب سر پہ آبنی تو خونزہ خود گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں آئی اور اس بہادری سے مقابلہ کیا کہ کشور خاں سپہ سالار عادل شاہ تاب نہ لا سکا اور اس طرح خونزہ اپنے بقیہ لشکر سمیت بچی۔

عادل شاہ دور اندیش اور خونزہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا

اسے یقین تھا کہ ضدی اور بہادر ملکہ بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گی اس نے سب سے پہلے تغال خاں سے صلح کی اور اس کے بعد ابراھیم سر پر آ دھمکا، گو خونزہ ابراھیم کی عیاری سے واقف تھی، مگر اس لئے کہ علی عادل شاہ کی طاقت نہ بڑھے ابراھیم کی مدد کو روانہ ہوئی، علی عادل شاہ پر خونزہ کا رعب اس قدر چھایا ہوا تھا کہ اُس کی آمد کی خبر سنتے ہی ناکام واپس گیا۔

ابراھیم نے ایک ہندو راجہ بیلتمراج کو بھی مدد کے لئے بلایا تھا، خونزہ نے قصد کیا کہ اگر عادل چلا گیا تو اس کو نہ چھوڑنا چاہیئے اور متفقہ حملہ کریں، مگر اس لئے کہ خونزہ نے سلطنت کا بڑا اختیار اپنے دو نو بھائیوں عین الملوک اور تاج خاں کو دے رکھا تھا، اور یہ کم بخت بجائے اسکے کہ ملکہ کے مددگار ہوتے عیش و عشرت میں مصروف تھے۔ خود خونزہ کے اپنے ارکین اس انتظام کے برخلاف تھے، اور اندر ہی اندر ان دونوں بھائیوں کا بدلہ خونزہ سے لینے کی فکر میں تھے، چنانچہ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر انہوں نے بیلتمراج اور ابراھیم کو اپنا موافق بنا خونزہ کا ساتھ چھوڑ دیا۔

علی عادل اس موقعہ کی تاک میں تھا، خونزہ کو تنہا دیکھ کر حملہ آور ہوا ۹۷۴ھ میں گھمسان کا رن پڑا، ملکہ نے اس دلیری سے دادِ شجاعت دی کہ دشمن پریشان ہو گیا اور دونو لشکر اپنے اپنے گھر واپس ہوئے۔

خونزہ بدلے کی تاک میں تھی مگر اس لئے مجبور تھی کہ اِدھر لڑکا اُدھر دونو بھائی خواب خرگوش میں تھے اور سردار مخالف، تاہم اس نے ایک لشکر مقابلہ کے لئے بھیجا، مگر شکست ہوئی۔ یہ رنگ دیکھ کر خونزہ حیران ہو گئی

اور اُس نے فوراً دربار کیا۔ دونوں بھائیوں کو دھمکایا، لڑکے کو حکم دیا کہ بغیر ہماری اجازت کے کسی سے نہ ملے اور خود ایک لشکرِ جرار کی تیاری میں مصروف ہوئی۔ مگر جس وقت خونزہ ان کارروائیوں میں مصروف تھی اور دن رات حملہ کی تیاریاں کر رہی تھی باہمی سازش ہوئی اور چند آدمی کسی نہ کسی طرح اس کے لڑکے مرتضٰے شاہ سے مل کر خونزہ کی گرفتاری پر آمادہ ہوئے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک ایسے ہی وقت خونزہ نے مرتضٰے کو طلب کیا، وہ سمجھا کہ راز کھل گیا، ڈرتا کانپتا آیا اور سارا حال کہہ دیا۔ اتنا سنتے ہی خونزہ آگ بگولا ہو گئی۔ سب سے پہلے جمال الدین حسین کو فوراً گرفتار کیا۔ اور جیل خانے بھیج دیا۔ سازشی لوگ یہ دیکھتے ہی فرار ہو گئے۔ ہر چند خونزہ نے ان کو بلانے کی کوشش کی مگر وہ نہ آئے۔

۹۷۵ھ میں خونزہ ہمایوں نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لی اور مقابلہ کے واسطے باہر آئی۔ افسوس یہ ہے کہ بیوفا مرتضٰی نے جو اس کا لختِ جگر تھا دھوکا دیا، اور فوج سے وعدہ کیا کہ اگر خونزہ کو معزول کر کے مجھ کو بادشاہ کر دیا تو انعام واکرام سے مالا مال کر دوں گا۔ خونزہ معہ اپنی فوج کے دامن کالورمیں تھی کہ رات کے وقت مرتضٰے نظام شاہ نے ماں سے شکار کی اجازت طلب کی، خونزہ ناواقف تھی اجازت دے دی۔ بڑے بڑے امرا اس کے ساتھ ہو گئے اور چند معمولی آدمیوں کے سوا کوئی نہ رہا۔ یہ رنگ دیکھتے ہی خونزہ سمجھ گئی کہ دال میں کالا ہے، دن ختم ہو گیا تھا، رات سر پر تھی اور دن کے واقعات سے خونزہ کو یقین ہو گیا تھا کہ آج کوئی گل کھلے گا۔ مرتضٰی واپس

آکر تھوڑے فاصلہ پر وقت کا منتظر تھا کہ موصن خاں جو نہایت بہادر تھا گرفتاری کے واسطے خونزہ کے پاس حاضر ہوا۔ خونزہ نے فوراً دوسرے خیمہ میں جا کر ہتیار لگاتے اور مسلح ہو کر باہر نکل کر آواز دی کہ او کمینے غلام باہر آ۔ موھن تڑپ کر باہر نکلا، خود بھی مسلح تھا ننگی تلوار ہاتھ میں تھی، مگر خونزہ نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ گردن الگ جا پڑی، باغیوں نے اُسی وقت حلبش خاں جیسے سخت مزاج اور تند خو کو روانہ کیا، حلبش خاں نے بآواز بلند کہا "آپ میری قید میں ہیں" یہ کہہ کر جھپٹا، خونزہ نے تلوار اُٹھائی، مگر ابھی وار نہ کیا تھا کہ حلبش خان نے ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے مروڑ کر تلوار چھین لی، یہ ۶۷۲ھ کا ذکر ہے۔ اب وہ وقت آتا ہے کہ سننے والے مشکل سے ضبط کر سکتے ہیں، ملکہ خونزہ ھمایوں قیدی کی طرح ننگی تلواروں کے پہرہ میں بیٹے کے سامنے لائی گئی مرتضیٰ شاہ جو اس کے پیٹ کا بیٹا تھا ہنسا اور حکم دیا کہ "قید میں رکھو"

خونزہ ھمایوں نہایت غیور اور آن بان کی عورت تھی اُس نے صرف اتنا کہا "خدا نہ کرے کہ میں آج کے بعد تیری صورت دیکھوں، اب تخت پر بیٹھا ہے تو حکومت کی ذمہ داری کو سمجھ"

خونزہ نے شوہر کے بعد سات سال حکومت کی، اس کی اولاد میں لڑکے تو دونوں نالائق نکلے مگر لڑکی چاند سلطانہ ایسی پیدا ہوئی کہ زنانہ تاریخ اس پر جس قدر فخر کرے کم ہے۔

عصمت ۱۹۳۲ء

شہنشاہ و شہنشاہ بیگم شاہجہان آباد میں

دھن بھاگ! سرزمین شاہجہان آباد! مدتوں پیچھے! تیری آنکھیں! اپنے شہنشاہ کے دیدار سے منور ہوتی ہیں! قدردانی کی آنکھوں سے دیکھ اور مہربانی کی آغوش پھیلا کر اس حکمراں کا خیر مقدم کر! جو سات سمندر پار سے تیری عزت افزائی کو آیا۔ چمنستان ہندوستان کے نونہالو! تصور کی آنکھوں سے دیکھو! دلی کا چپہ چپہ تم کو رنگ برنگ کے تماشے دکھائے گا! اور یہ بگڑ بگڑ کر بننے والی دلی! اپنی تاریخ سنا کر تم کو محو کر دیگی! یہی ہے وہ سرزمین جس پر تیموری اور نادری تلوار نے خون کے دریا بہائے اکبر کی بے تعصبی اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی! شاہجہانی عمارتوں کو دل میں جگہ دی۔ اور اورنگ زیب جیسے فرشتہ رحمت کی مقدس پیشانی اسی خاک پر حقیقی شہنشاہ کے حضور میں جھکی! جشن اکبری اور شاہجہانی چہل پہل اکی دیکھنے والی دلی! مٹنے والی روحوں پر آج وفاداری کے پھول چڑھا! ہمایوں کی روح کو فاتحہ سے یاد کر! اور اس بادشاہ کے حق میں دعائے ترقی دولت و عمر کے نعرے لگا! جس نے اجڑے دیار گلزار بنا دیے!

۷ر دسمبر ۱۹۱۱ء کیسی مبارک رات اور خوشگوار صبح ہے! سینکڑوں

بندگانِ خدا اپنے بادشاہ کے دیکھنے کو اندھیرے منہ گھر سے نکل پڑے! پردہ نشین بیبیوں نے کس طرح رات کاٹی؟ تمہاری مشتاق نگاہیں شاہی سواری کے ساتھ ہیں! اور قدردان بادشاہ جس نے دِلّی کے جنگل کو منگل کردیا! تمہارے اُجاڑ شہر کو آباد کردے گا! دلّی! ہائے دلّی! بگڑی ہوئی دلّی! دارالسلطنت ہوگی اور خاکِ دلّی کا ہر ذرّہ اس ذرّہ نوازی کی داد دے گا! دیکھنے والوں تامّل کی نگاہوں سے دیکھنا! مدتوں کی اُجڑی کھُٹی دُلہن آج اپنا بناؤ سنگار کرتی ہے!

سلیم گڑھ سے شاہی کیمپ تک مسلّح فوجیں دو رویہ کھڑی ہیں۔ وفاداری کا دریا اِن کے دلوں میں لہریں لے رہا ہے اور مشتاق نگاہیں قلعہ معلیٰ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہیں۔ سیلانیوں کا ٹڈی دل کوٹھوں پر اور سڑکوں پر، دکانوں پر اور چھتوں پر اس وقت کا انتظار کر رہا ہے۔ جب سلامی کی توپیں فضائے عالم میں گونج کر شاہی تشریف آوری کی خبر دلّی کے ہر گوشہ میں پہنچا دیں!

لیجیے لیجیے! شاہی ٹرین چمنستانِ سلیم گڑھ میں گلگشت کرتی ہوئی آپہونچی۔ شہنشاہ معظم فیلڈ مارشل کی وردی زیب تن، ستارۂ ہند کا تمغہ لگائے باہر تشریف لائے۔ قیصرۂ ہند سفید اطلس کی پوشاک آرڈر آف گارٹر کراؤن آف انڈیا کے تمغہ لگائے گاڑی سے اتریں۔ گارڈ آف آنر نے سلامی دی اور [illegible] استقبال کیا!

اللہ اکبر! کیا وقت ہے [illegible] ہو رہے ہیں [illegible] اپنے شہنشاہ کی [illegible] ہندی [illegible] کے پھول برسا رہا ہے۔ کہاں [illegible] اکبر [illegible] شان

کرنے والے ہندو مسلمانو! آؤ اور اپنے شہنشاہ کے درشن کرو۔ اُٹھو اُٹھو بے خبری کی نیند سونے والو! اُٹھو! اور اس جشن کا لطف اُٹھاؤ۔ سینکڑوں برس بعد دلّی دلّی بنی ہے! اور دور دور سے لوگ اس کی رونمائی کو آرہے ہیں!

قلعہ کے دروازہ سے جلوسِ شاہی روانہ ہوا۔ وسط میں پہلے سیکشن میں گورنر لفٹننٹ گورنر اور چیف کمشنر معہ افواج، اس کے بعد سرزمینِ ہندوستان کا وہ مہمان جس کے دیکھنے کو آنکھیں ترس رہی تھیں۔

ملکہ الگزینڈرا کا لال، تاجِ برطانیہ کا گوہرِ آب دار، شہنشاہِ معظم اسپ کی گھوڑے پر سوار تھے۔ پیچھے اور دُھارا ڈنگ اور لارڈ کلرنبو پہلو بہ پہلو، اس کے بعد علیا حضرت کی گاڑی۔ رعیت تالیوں اور خوشی کے نعروں سے اپنے جوش کا اظہار کر رہی تھی۔ شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ کی جو ادا اس وقت دلّی والوں کے دل لے گئی وہ ہز امپیریل میجسٹیز کا خلق تھا۔ شادمانی اپنے جواہرات دونوں چہروں پر نچھاور کر رہی تھی اور ہاتھ اپنی رعیت کے اظہارِ جوش کو سچّے دل سے قبول کر رہے تھے۔

اب جلوس اس مقدس عمارت کے قریب ہے جس کا ایک ایک پتھر شاہجہاں کی متبرک روح پر صبح و شام سلام بھیج رہا ہے۔ مسجد جامع شہنشاہِ معظم کی مسلمان رعایا کی وفاداری کا پھریرا سنہری حرفوں میں اُڑا رہی تھی۔ ہزاروں مسلمان مرد اور عورت خانۂ خدا میں بیٹھے اخلاص و عقیدت کے تحفے پیش کر رہے تھے۔ ظلِ الٰہی بادشاہ اور بادشاہ بیگم تخت کی آنکھوں سے دیکھتا [illegible] سے [illegible] پہنچے۔ والیانِ ریاست کی سواریاں [illegible] ان کی [illegible] فوج کی رنگا

بہ رنگ کی وردیاں جلوس کی عزت کو دوبالا کر رہی تھیں۔ کیسا موثر سماں تھا۔ در و دیوار سے بہار کا موسم ٹپک رہا تھا۔ تبت کے بودھ۔ برہما کے سپاہی کلغیاں لگائے طرے باندھے ہشاش بشاش چلے جا رہے تھے۔ دلی کی سرزمین طرح طرح کے جواہرات اُگل رہی تھی اور آسمان فرحت و انبساط کی بارش سے دم بھر کو نہ اکتاتا تھا۔ پہاڑی پر پہونچکر ممبران لیجسلیٹو کونسل کا ایڈریس پیش کیا گیا جو وفاداری کی ہوا میں گونجتا ہوا حضور اقدس تک پہنچا۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ بادشاہ وشہنشاہ جو دلّی کی سرزمین پر حکومت کر چکے آج خاک کی بستی میں پڑے سوتے تھے اور نظام عالم کے زبردست ہاتھ ان کو تھپک تھپک کر لوریاں دے رہے تھے، مگر ان میں سے کوئی بھی بلا شرکت غیرے اس قدر وسیع سلطنت کا حکمراں نہ ہوا جو شہنشاہ معظم کے زیر نگیں ہے۔

سہ پہر کے قریب جب شہنشاہ معظم کیمپ میں داخل ہوئے تو چند والیان ریاست کو شرف باریابی حاصل ہوا۔

۸ تاریخ کی صبح کو باقی والیانِ ریاست نے شہنشاہ کے روبرو تسلیم خم کیا اور شام کے قریب خاندوراخاں کی کھڑکی سے باہر اس پارک میں جو اسی غرض سے تیار کیا گیا تھا۔ شہنشاہ مرحوم ایڈورڈ ھفتم کا بت نصب کرنے کی رسم ادا کی گئی۔ بت چونکہ تیار نہ تھا لوح یادگار کا افتتاح شاہی ہاتھوں سے ہوا سلامی کی توپیں سر ہوئیں اور مشرقی رخ پر یہ لوح رکھی گئی۔ جس پر کندہ ہے "ایڈورڈ ھفتم بادشاہ قیصر"

حقوق نسواں کو جہالت کی چھری سے ذبح کرنے والے بزرگو! آنکھوں پٹی باندھ کر انصاف کا خون نہ کرنا! آج خواتین ہند کا ایڈریس اس خاتون

کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جو ہماری مہارانی اور شہنشاہ بیگم ہے!
ایڈریس کا جواب غور سے سننا! اور ان پھولوں کو آنکھوں پر رکھنا۔
"اوراق تاریخ پکار پکار کر کہہ رہے ہے کہ ہندوستانی عورتیں کس طرح فلاح وبہبود کا سامان اپنے گھر پر کر سکتی ہیں۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوئی۔ کہ پردہ نشین بی بیوں میں ترقی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بی بیاں دل میں ترقی تعلیم کا خیال کافی رکھیں گی تاکہ پیدا ہونے والی لڑکیاں اپنے شوہروں کی کارآمد رفیق اور غم خوار ہمدم ثابت ہوں"۔

۱۰ ردسمبر ۱۹۱۱ء کو شہنشاہ معظم وشہنشاہ بیگم نے جزیرہ جگت پور میں نماز دعا میں شرکت فرمائی۔ لارڈ بشپ اوف مدراس نے شہنشاہ حقیقی کی درگاہ میں شہنشاہ وشہنشاہ بیگم کی ترقی وسلامتی کے واسطے التجا کی آٹھ ہزار سے زیادہ مخلوق اس دعا میں شریک تھی اور یہ ہزارہا بندگانِ خدا اس درگاہ میں سربسجود تھے جس کے ازلی وابدی راج کے گیت ہر طرف بج رہے تھے۔

۱۱ ردسمبر کو فوجوں کا معائنہ پولو کی سیر ہوئی اور ۱۲ ردسمبر اُس جشن کا روز تھا جس کی گھڑیاں گنی جا رہی تھیں ادھر شہسوار مشرق نے رات کا گھونگھٹ کھولا اُدھر بینڈ باجے نے جشن شاہی کے ترانے گانے شروع کئے۔ سنگینوں کی چمک سے پرنس روڈ جگمگا اٹھی۔ دور دور کے راجہ اور نواب وفاداری کے تلک لگائے چلے آ رہے تھے۔ رعیت اپنے بادشاہ کے دیدار سے نہال نہال تھی۔ امراء رؤسا نے فوج کی کروفر لباس کی ٹیپ ٹاپ سے اپنی ہمت کے نمونے دکھائے۔ تو غربا کا اشتیاق دیدار ان کی عالی حوصلگی کا نمونہ تھا۔ یہ دیدار شاہی کے بھوکے اور فرمان شاہی کے پیاسے صبح ہی صبح

موجود ہوئے تھے۔ بیس ہزار کے قریب فوج وسط صحن میں مسلح کھڑی تھی، اور لاکھ ڈیڑھ لاکھ آنکھیں محبت کا سرمہ لگائے وفاداری میں ڈوبی ہوئی اپنے شہنشاہ کے جمال جہاں آرا کی منتظر تھیں۔ گیارہ بجتے ہی ویرا ایکسیلینز ڈریگن گارڈ کو جلو میں لئے تشریف فرما ہوئے۔ یہ سماں بدستور تھا کہ توپوں کی گونج ویرا امپیریل مجسٹیز کی تشریف آوری کا مژدہ لائی۔ سواری کا قریب پہنچنا تھا کہ تمام حاضرین آداب شاہی کے واسطے سروقد کھڑے ہو گئے۔ فوج نے سلامی اتاری۔ باجوں نے اظہار شادمانی کیا۔ رعیت نے چیرز کے نعرے لگائے اور سواری شامیانہ میں آئی۔

چھوٹے چھوٹے شہزادوں نے آگے پیچھے سے خلعت شاہی کو سہارا دیا۔ ہز ایکسیلنسی نے استقبال کیا اور بادشاہ معہ بادشاہ بیگم تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوئے۔

اعلان و تقریر شاہی کے بعد اب وہ سماں تھا جب تمام عہدہ داران و والیان ریاست شہنشاہ کے روبرو سر تسلیم خم کر رہے تھے۔ سب سے پہلے وائسرائے نے آگے بڑھ کر اظہار اطاعت کیا اور پھر یکے بعد دیگرے تمام حکام و والیان ریاست نے اس رسم کی ادائیگی نے تقریباً ایک گھنٹہ لیا۔

اب شاہ اور بادشاہ بیگم تخت سے اٹھے اور ہاتھ میں ہاتھ دے کر شاہی خیمہ کی طرف روانہ ہوئے۔ دلی کی زمین دلہن بنی کر ان قدموں پر نثار ہو رہی تھی۔ ویرا امپیریل مجسٹیز نے ڈلیس لینے تخت پر قدم رکھا۔ ویرا ایکسیلینز دائیں طرف اور بیچ ادھر ادھر موجود تھے۔ چند لمحہ گذرے ہوں گے کہ نقیب آگے بڑھا بگل بجایا اور ہیرلڈ نے شہنشاہ کی تخت نشینی کا اعلان انگریزی میں اور ملک عمر حیات خاں صاحب نے اردو میں کیا اور ہز ایکسیلنسی نے فرمان

شاہی سُنایا۔

۱۳۔ دسمبر کو دس بجے کے بعد اعلیٰ حضرت نے فوجی افسروں کو شرف ملاقات بخشا۔ اس وقت توپ خانہ کے وہ سات بہادر پیش کئے جنہوں نے اپنی جانوں پر کھیل کر فیروز پور کے توپ خانہ کو بچایا تھا۔ ان جاں نثاروں کی محنت ٹھکانے لگی۔ قدر دانی نے ان کے حوصلے بڑھائے۔ تاج شاہی نے ان کی جرأت و شجاعت کی داد دی اور شہنشاہ معظم نے اپنے ہاتھ سے شاہی تمغہ ان کے سینوں پر لگایا۔

زمانہ قدیم کی یہ رسم کہ جاں نثار سورما اپنی تلواروں کے دستے بادشاہ کے روبرو جھکا دیں اس وقت ادا کی گئی اور تین معزز ہندوستانیوں نے اپنی تلواریں حضور شاہی میں جھکائیں اور شہنشاہ معظم نے اپنا ہاتھ اُن کو لگا دیا۔

شام کے وقت قلعہ میں گارڈن پارٹی ہوئی یہ عجیب دلکش سماں تھا۔ شاہانِ مغلیہ کے جشن کانوں سے سنے اور تاج برطانیہ کی پہلی پہل آنکھوں سے دیکھی۔ قلعہ معلّٰی آج چوتھی کی دُلہن بنا ہوا تھا۔ ہری ہری گھاس کے تختے رنگ برنگ کے پھول انواع و اقسام کی بیلیں اس عروس کا زیور تھیں۔ فوارے چھوٹ رہے تھے۔ اور وہ در و دیوار جو شاہجہاں و ممتاز محل کے جلسوں کو ترس گئے تھے آج ان کی عزت افزائی ہو رہی تھی۔ ساڑھے تین بجے بادشاہ اور بادشاہ بیگم ثمن برج میں تشریف لائے اور مشتاق رعیت کو اپنے دیدار سے منور کیا۔ پھر لوگوں کی سیر کرتے ہوئے جس کے نیچے جمنا اٹکھیلیاں کر رہی تھی دیوان خاص میں تشریف لے گئے۔

آج رات کو شہر پر عجیب جوبن تھا۔ آتشبازی اور روشنی نے شہر کو جگمگا دیا۔

۱۴ ؍دسمبر کو فوجی معائنہ ہوا اور اُنچاس ہزار فوج شہنشاہ کے سامنے گذری ایک خاص وقت میں اور ایک خاص مقام پر فوج کا اِس قدر اژدہام پہلا اتفاق تھا یہ ایسا دلچسپ اور انوکھا نظارہ تھا کہ مرتے دم تک دیکھنے والی آنکھیں آج تک اُس کو یاد کر رہی ہیں۔ شام کو خطابات تقسیم ہوئے۔ اس وقت شہنشاہ معظم سٹار آوف انڈیا کا لباس زیب تن کئے تھے۔ سب سے پہلے ملکہ معظمہ نے اپنا سر شہنشاہ کے آگے جھکایا اور اعلیٰ حضرت نے تمغہ گرانڈ کراس آوف امپیر عطا فرمایا۔

۱۵ ؍دسمبر کو وہ رسم ادا ہوئی جو دار السلطنت کا سنگِ بنیاد تھا اور جو گورنمنٹ آوف انڈیا کے کیمپ کے باغیچہ میں رکھا گیا۔

پڑھنے والو! وہ وقت پھر آئے گا! کہ دِلّی ایک چیز ہوگی! جو باتیں آج فسانہ ہوگئیں، یہاں پر نظر آئیں گی! اسی خاک سے پھر ایسے ایسے لوگ اٹھیں گے! جن پر دلّی فخر کرے گی! باکمالوں کا مجمع پھر دکھائی دے گا! گو ہوا کا رُخ بدلا ہوا ہوگا، اور زمانہ اگلے مذاقوں کی ہنسی اُڑائے گا! مگر اسی بستی میں وہ صورتیں بھی دکھائی دیں گی جو بزرگوں کے نام آنکھوں سے لگائیں، عالمِ تنہائی میں سونے والو، میری مبارک باد قبول کرو، جو خزانے تمہارے ساتھ دفن ہوئے، اب دُنیا ان کی قدر کرے گی، بڑے بڑے محقق تمہارے مٹی کے ڈھیروں کی پرستش کریں گے، اور مغربی سیاح یونیورسٹی کی لالٹین سے تمہارے کھوج لگائیگا، زمانہ کی اندھیری گھپ رات سر پر ہوگی، اور علوم کی جگمگاتی روشنی میں تمہاری خاک کا ہر ذرہ اکسیر کا کام دے گا! ہماری ہڈیاں گل کر خاک ہو چکی ہوں گی۔ مگر دلّی کو دار السلطنت دیکھنے والی آنکھیں ہمارے بیان کی تصدیق کرینگی، سننے والی روحو! ظاہری آنکھوں نے تمہارے خاکی اجسام چھپا دیئے۔ مگر وہ وقت آگیا کہ تلاشیوں کی آنکھیں تمہارے ان پھولوں کو سر پر رکھیں جنکی

مہکار بقائے دوام کے خلعت سے وابستہ ہے۔

یہ پھانس دل میں کھٹک رہی ہے اور کھٹکے گی کہ اقدر دانی کے دریا جن کی موجیں آبدار موتیوں اور چمکتے ہوئے جواہرات سے خلق خدا کو مالا مال کرتی تھیں خاموش پڑے ہیں، ہوا کے تھپیڑے بینہ کے چھینٹے اور بڑے بڑے طوفان اوپر ہی اوپر گذر رہے ہیں۔ مگر نہیں! نہیں! دلِ بے قرار! اس باسی کڑھی میں پھر اُبال آئے گا! اور "تاج برطانیہ یونیورسٹی کے انعام سے" اِن مُردوں کو جِلائے گا! یہ بند پانی اور ٹھہرے ہوئے دریا پھر حرکت کریں گے۔ شہنشاہ معظم کی مسیحائی اِن بے خبروں میں جانِ ڈاکران گمناموں کے نام روشن کرے گی، اور زمانے کا ساتھ نہ دینے والی قوم، جو گردِ ادبار میں مٹ کر خاک ہو گئی، احساس کے خلعت فاخرہ سے مزین ہوگی، اور ان سروں پر جو فلاح قوم سے ٹکریں مار رہے ہیں، اپنے ہاتھ سے سدا بہار پھول چڑھائے گی۔

۱۷ دسمبر جس دم قدم کی تمام چہل پہل اور رونق تھی یعنے شہنشاہ معظم اور ملکہ معظمہ آج دِلّی سے روانہ ہوئے اور دِلّی نے بادشاہ اور بادشاہ بیگم کو خدا حافظ کہا۔ سلیم گڑھ کا اسٹیشن انواع واقسام کی گلکاریوں سے آراستہ تھا اور رعیت ہِز امپیریل میجسٹی کی جدائی سے بہت ہی متاثر تھی۔ عنایتِ خسروانہ کا شکریہ وہ سلام تھے جن کی ہر چہار طرف سے بوچھاڑ ہو رہی تھی، شہنشاہ کی محبت نے یوں ہی دلوں میں گھر کر لئے تھے اس وقت ہز میجسٹی کا دیر تک چلتی گاڑی میں کھڑا رہنا اور اپنی رعیت کے سلاموں کا جواب دینا ایک ایسا مؤثر نظارہ تھا کہ بہت سی آنکھیں اس جدائی پر آنسو بھر لائیں۔

تمدن ۱۹۱۱ء

تصویر انقلاب

شیخ سعدی (اللہ انہیں جنت نصیب کرے) اپنی مشہور کتاب کریما میں فرماتے ہیں "جہاں دنیا کی بہت سی باتیں یاد رکھو وہاں ایک سعدی کی بھی یاد رکھنا کہ اس ناپائدار دنیا سے دل نہ لگانا اس کی کسی حالت کو قرار نہیں"۔ کہنے کو تو سب ہی کہتے ہیں اور فقط کہتے ہی نہیں سمجھتے بھی ہیں کہ دنیا فانی زندگی چند روزہ ہے لیکن اس سمجھنے اور کہنے پر اگر عمل بھی کرنے لگیں اور شیخ کی اس نصیحت کو جو سونے سے لکھنے کے قابل ہے، ہر وقت اور ہر لمحہ اپنے سامنے رکھیں تو حالتوں میں آسمان زمین کا فرق ہو جائے۔ کیوں وہ طاقتور اپنے زور پر گھمنڈ کرے جو جانتا ہے کہ ایک طاقت مجھ سے زبردست بھی ایسی ہے جو دم بھر میں میری طاقت کو خاک میں ملا دے گی۔ کس لئے وہ امیر اپنی دولت پر ناز کرے جو سمجھتا ہے کہ میری دولت کاغذ کی ناؤ ہے اور زمانہ اتنی قدرت رکھتا ہے کہ پل مارتے میں مجھے بھیک منگوا دے۔ زبان سے کہہ لینا اور چیز ہے مگر جو کہنا وہ کرنا اور چیز علم اسی وقت کام کا ہے جب اس پر عمل ہو۔ یوں جاننے کو کوئی شخص دنیا بھر کی باتیں جانے مگر اس کا جاننا کس کام کا جب اس پر عمل ہی نہ کرے۔

دنیا فانی ہے اور بچہ بچہ جانتا ہے کہ موت اور انقلاب یہ دو کھٹکے

انسان کی جان کے ساتھ ہر وقت لگے ہوتے ہیں۔ خاصے اچھے تندرست ہٹے کٹے، کھاتے پیتے ذرا دل کی حرکت بند ہوئی اور ہمیشہ کو سو گئے۔ سلطنتوں کے بادشاہ، ریاستوں کے مالک، امیر کبیر عیش آرام کرتے، حکومت کے ڈنکے بجاتے آناً فاناً روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ تاریخ بغداد ایک واقعہ ایسا بیان کر رہی ہے جس کو سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں جس لڑکے کی پیدائش پر ہزاروں لاکھوں دینار و درہم تقسیم ہوئے ایک قصیدے پر تیس ہزار درہم کا انعام ملا تھا۔ اس لڑکے کو تقدیر کیا وقت دکھاتی ہے۔ زمانہ برامکہ کے اقبال کا چراغ گل کر چکا ہے وہی شاعر جو ایک قصیدے سے عمر بھر کے لئے مالا مال ہو گیا، غسل کے واسطے حمام میں جاتا ہے، جو لڑکا خدمت کے واسطے مقرر ہوا ہے وہ نہلا رہا ہے۔ امیر نہاتے نہاتے اپنے اسی قصیدے کے شعر گنگنانے لگا اور لڑکے کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے شروع ہو گئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جس لڑکے کی پیدائش نے معمولی شاعر کو امیر کبیر بنا دیا تھا آج وہی بچہ اُس کے ہاتھ پاؤں مانجھ رہا ہے۔ کیا اچھی نصیحت کی ہے۔ ابو نواس نے سلطان عبد العزیز کو "عزیز بھولیو مت کہ اس تاج وار سر کو بے تاج کر دینا زمانہ کے آگے کوئی بڑی بات نہیں۔"

اپریل ۱۸۶۱ء پہلا موقعہ تھا جب شہنشاہ ایڈورڈ ھفتم کی ملاقات شہزادی الگزنڈرا سے ہوئی۔ مگر افسوس یہ خوشی پائدار نہ نکلی اور شہزادے کے والد بزرگوار کی موت نے کرکری کر دی۔ اس صدمہ کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ شہزادے کو بیت المقدس اور مصر جانا پڑا۔

سال بھر کے بعد ۹ ستمبر ۱۸۶۲ء کو ملکہ الگزنڈرا کی نسبت

ہوئی اور ۱۰ مارچ ۱۸۶۳ء کو سینٹ جارج کے گرجا میں شادی ہوئی۔ ڈاکٹر فارمن نے اس شادی کی کیفیت اس طرح لکھی ہے کہ مجھے اس وقت دو باتیں دیکھکر بہت ہی تعجب ہوا۔ ایک تو یہ کہ تمام شہزادیوں کی آنکھ سے زار و قطار آنسو جاری تھے دولہا کو دیکھ دیکھ کر ان کا دل بھرا چلا آتا تھا اور مرے ہوئے باپ کی یاد اُن کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے اڑا رہی تھی وہ روتی جاتی تھیں اور چپکے چپکے آنسو پونچھتی جاتی تھیں۔

دوسری بات وہ تھی جب ملکہ کے مرحوم خاوند یعنی دولہا کے باپ کا گیت گایا گیا اور ملکہ وکٹوریا نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ملکہ ابدی راج یعنی خدا کی حکومت کے آگے اپنے خاوند کے ساتھ عاجزی سے کھڑی ہوئی ہے۔

شادی ہو گئی میاں بیوی رہنے سہنے لگے۔ ملکہ الگزنڈرا نے اپنی عقلمندی، فرماں برداری، بردباری اور محبت سے چند ہی روز میں یہ ثابت کر دیا کہ نیک بیوی سے زیادہ دنیا میں کوئی نعمت نہیں۔ دونوں زندگیاں نہایت اطمینان سے بسر ہونے لگیں۔ روپیہ، عزت، سلوک، ایک اولاد کی البتہ کسر تھی ایسے گھر پر خدا کی عنایت کیوں نہ ہوتی۔ یہ مراد بھی پوری ہوئی۔ غرض کوئی ارمان ظاہر میں ایسا نہ تھا جو پورا نہ ہوا ہو۔

لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے خوش میاں بیوی دنیا میں بہت کم ہوں گے مگر افسوس ۱۸۹۲ء کچھ ایسا منحوس سال تھا کہ اس نے شاہی قلبوں پر زبردست داغ دیا اور ڈیوک اوف کلیرنس جوان بیٹا آنکھوں کے سامنے سے اٹھ گیا۔ ملکہ الگزنڈرا پر اس صدمہ کا سخت اثر ہوا۔ بیٹے کے فراق نے بہت سے ارمانوں کا خاتمہ کر دیا۔ مگر اس نازک موقعہ پر جس دور اندیشی اور صبر و استقلال



سے ملکہ نے کام لیا ہے وہ تعریف کے قابل ہے، اولاد والے دل سمجھ سکتے ہیں کہ ملکہ کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ مگر وہ ہمیشہ شہنشاہ کو سمجھاتی تھیں اور اُن کا غم غلط کرتی تھیں۔

جس طرح شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کی یاد رعیت کے دل سے کبھی فراموش نہیں ہوسکتی اسی طرح ملکہ الگزنڈرا کی شفقت ہر وقت ہمارے دلوں میں تازہ رہے گی خصوصاً وہ محبت بھرا پیغام جو ملکہ نے رعیت کو بھیجا اور یہ درخواست کی کہ اپنی دعاؤں میں مجھکو یاد رکھنا۔

وہ تاج جو کل تک ملکہ الگزنڈرا کے سر کی زینت تھا آج ملکہ میری کے سر پر جگمگا رہا ہے اور بآواز بلند شیخ کا یہ شعر پڑھ رہا ہے:۔

منہ دل بریں گنبد روزگار — زسعدی ہمیں یک سخن یاددار

ہمارے موجودہ حکمراں جارج پنجم کے سعادت مند اور فرماں بردار ہونے میں کلام نہیں انھوں نے باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی محترم ماں کی دلداری میں کوئی کسر نہیں کی۔ مگر جس طرح قدرت کے قانون نے ایڈورڈ ہفتم جیسے سینتالیس برس کے ہمدم و ہمراز کو ملکہ الگزنڈرا سے ہمیشہ کے واسطے جدا کر کے تمام تعلقات کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح زمانہ کی رفتار نے تاج شاہی ملکہ الگزنڈرا کے سر سے اُتار کر ملکہ میری کے سر پر رکھدیا۔ اور وہ محترم بی بی جو ایڈورڈ جیسے حکمراں کی ملکہ اور برطانیہ جیسی سلطنت کی مالک تھی آج بے تاج نظر آرہی ہے۔

ملکہ الگزنڈرا کی یہ تصویر انقلاب کا ایک نمونہ ہے اور اس کا ایک ایک حرف دوسروں کے لئے سبق ہے جس کو دیکھ کر امام ابوسفیان کے اس خط کی تصدیق ہوتی ہے جو ہارون کو لکھا اور نصیحت کی کہ سلطنت سدا تیرے پاس رہنے والی نہیں۔ اس کو قیام ہوتا تو تجھ تک کیونکر آتی جس طرح تیرے پاس آئی اسی طرح تجھ سے آگے بڑھ جائے گی۔

عصمت سنہ ۱۹۱۰ء

قلندر پاشا

شاہجہان کے دورِ حکومت میں دو حقیقی بہنوں نے بیٹا بیٹی کی منگنی کی، جب بچے سیانے ہوئے تو لڑکی کا باپ مر گیا، اور کچھ ایسی افتاد پڑی کہ دانت کرید نے کو تنکا تک نہ رہا۔ لڑکے کے باپ کو ایک تجارت میں غیر معمولی فائدہ ہوا، اور چند ہی روز میں ایک عالیشان مکان تیار ہو گیا۔ لڑکی جب بہت بڑی ہو گئی اور خالہ نے جس کے لڑکے سے منگنی ہو چکی تھی مطلق توجہ نہ کی تو لڑکی کی ماں خود ہی ایک پھٹا سا برقع اور ٹوٹی سی جوتی پہنے ہوئے بہن کے ہاں گئی۔ اوّل تو امیر بہن کو اپنی لونڈیوں اور ماماؤں کے سامنے اس کو بہن کہتے ہوئے شرم آئی، اور کہہ دیا کہ یہ میرے پڑوس میں رہتی تھی اس لئے آپا آپا کہتی ہے۔ دوسرے اپنی طراری سے حرف مطلب زبان پر لانے ہی نہ دیا۔ جب غریب بہن نے دیکھا کہ امیر بہن نے بات بھی نہ پوچھی اور اب آرام کرنے چلی گئی تو بے حیا بن کر اس کی خوابگاہ میں داخل ہوئی اور مطلب بیان کیا، امیر بہن نے غصے سے کہا دیوانی ہوئی ہے، میری تیری کیا برابری۔ تیری بچی میرے بچے کے لائق ہے۔ جا دور ہو تجھے ایسی بات کہتے شرم نہیں آتی۔ میری طرف سے تو اپنی بیٹی قلندروں کو دے، مگر اب ادھر کا رخ نہ کیجو۔

۲

رات کا وقت تھا اور دونو حسرت و یاس کی تصویریں یعنی ماں
بیٹیاں ایک ٹوٹے ہوئے گھر میں جہاں بیٹھنے کو بوریا تک نہ تھا، زمین پر
بیٹھی ہوئی اپنی قسمت کو رو رہی تھیں کہ دروازہ پر فقیر نے صدا دی۔
بدنصیب ماں دروازے پر آئی اور کہا "قلندر ہم تو خود صبح سے بھوکے
ہیں تمہاری کیا خدمت کریں" قلندر نے کہا "اگر تم بھوکی ہو تو مجھ سے
لو اور اپنی کیفیت بیان کرو" عورت قلندر کی ہمدردی سے متاثر
ہوئی اور اندر بلا کر تمام داستان سنا دی، اور یہ بھی کہہ دیا کہ جوان
لڑکی کا گھر میں بٹھانا نامناسب ہے، اُس کم بخت نے تو کہہ دیا کہ میری
طرف سے اپنی بیٹی قلندروں کو دے، قلندر نے کچھ سوچا اور کہا۔
"بس تو یہ میری ہو گئی بھیک مانگوں گا، اور تم دونو کا پیٹ بھروں گا"
یہ کہہ کر فقیر نے اپنی جھولی اُلٹ دی اور چلتا ہوا۔

اس جھولی میں انواع و اقسام کے کھانے تھے اور ساتھ ہی
دو اشرفیاں بھی تھیں، دونو بیٹیاں باغ باغ ہوگئیں اور اب روز کا
یہ معمول ہو گیا کہ رات کو فقیر آتا اور جھولی اُلٹ دیتا، جس میں اشرفیاں
ہوتیں اور کھانا ہوتا، گھنٹہ دو گھنٹہ ٹھہرتا اور تھوڑی دیر کے واسطے
منہ لپیٹ کر پڑ رہتا، لڑکی اتنی دیر پاؤں دباتی، پھر قلندر چلا جاتا۔

۳

وہی دونوں ماں بیٹیاں ایک عالیشان مکان میں رہتی ہیں،
ایک کے بدلے چار لونڈیاں اور دو کے بدلے پانچ مامائیں، طرح طرح کے
کپڑے اعلٰے سے اعلٰے سامان موجود ہے اور آج ان دونوں کا وہ

دور ہے جس کا اُن کو وہم و گمان بھی نہ تھا، کہ ایک روز وہی حقیقی بہن جس کے لڑکے سے منگنی ہوئی تھی آئی اور کہا "لاؤ بہن میری بہو مجھ کو دو"
لڑکی کی ماں نے کہا "میں تو تمہارے کہنے کے بموجب اپنی لڑکی قلندر کو دے چکی" بیٹے کی انگڑی اور کہا "میں عدالت میں جاکر دعوے کروں گی، تم کو کیا حق تھا کہ قلندر کو دو" لڑکی کی ماں نے کہا "تم لڑکی کی خواستگار نہیں ہو، میں فقیر تھی تم نے جواب دے دیا، اب خدا نے میرے دن پھیر دیے تو تم متوجہ ہوتی ہو، میں مجبور ہوں کہ کچھ نہیں کر سکتی میں تو اپنی بچی قلندر کو دے چکی، اور میں نے تمہارا ہی کہا کر دیا"
لڑکے کی ماں سیدھی اُٹھ قاضی کے ہاں گئی اور اُس سے فریاد کی کہ "میری بہن نے یہ غضب کیا" قاضی نے اُسی وقت دونو ماں بیٹیوں کو طلب کیا، تو ان دونوں نے مفصل کیفیت بیان کی، قاضی نے پوچھا "وہ قلندر کون ہے" ماں نے کہا "میں نے ہمیشہ اُس کو رات کے اندھیرے میں دیکھا ہے" لڑکی نے کہا "میں نے صرف اس کے پاؤں دیکھے ہیں، میں اس کی صورت نہیں پہچانتی، البتہ اس کی پاؤں پہچانتی ہوں" جس روز قاضی کے ہاں دعوے ہوا اُسی روز سے قلندر نے آنا چھوڑ دیا۔

۴

رفتہ رفتہ یہ خبر شہنشاہ شاہ جہاں کے کانوں میں پہونچی اس نے دونوں ماں بیٹیوں کو بلایا۔ قلندر کو ہر چند تلاش کیا اُس کا پتہ نہ چلا، مجبور شہنشاہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ہر شخص اپنی پنڈلی کھولے اور اس لڑکی کو دکھاوے، اُسی وقت اس حکم کی تعمیل ہوئی جس قدر آدمی شاہ جہاں آباد میں موجود تھے تین دن تک متواتر حاضر ہوئے، لڑکی دور سے پنڈلی

دیکھتی اور کہہ دیتی کہ یہ نہیں ہے۔ جب سب ختم ہو گئے تو شہنشاہ نے چل کر خود اپنا پاؤں دکھایا کہ اب تمام شاہ جہاں آباد میں صرف میں باقی ہوں، لڑکی نے اس پاؤں کو سر پر رکھ لیا، اور عرض کیا۔

"جہاں پناہ وہ پاؤں یہی ہیں" اس وقت شہنشاہ نے اس کی خالہ یعنی لڑکے کی ماں سے جو بدھی بیٹھی تھی کہا:

"تو اس کی خواہاں نہ تھی تیرے سامنے صرف دولت تھی، تیرا دعویٰ غلط ہے" اور لڑکی سے کہا تو میری بیٹی ہے، جا اور خوش رہ۔"

قادسیہ کی لڑائی اور ایک خاتون کی حمیت

اس مہم کے واسطے جو مسلمانوں کی ہمسائیوں سے ہوئی دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے سعدؓ کو تیس ہزار فوج دے کر لڑنے کے لئے بھیجا ایرانیوں کا بادشاہ یزدگرد اور سپہ سالار رستم تھا جو ساٹھ ہزار جمعیت کو ساتھ لے کر ساباط سے نکلا اور قادسیہ پر ڈیرے ڈال دیئے لڑائی شروع ہوئی۔ دونوں طرف کے بہادروں نے اپنی اپنے مذہب پر جانیں قربان کرنی شروع کیں قادسیہ کا میدان آن کی آن میں لاشوں سے پٹ گیا اور ایسی سخت خونریزی ہوئی کہ آج تک تاریخ اس لڑائی کے نام سے کانپتی ہے۔ اسلامی سپہ سالار سعدؓ کو عرق النساء کی شکایت تھی وہ خود شریک جنگ نہ ہو سکتے تھے مگر بالاخانہ پر بیٹھے کھڑکیوں سے لڑائی کا رنگ دیکھ رہے تھے اور تمام احکام لڑائی کے متعلق خود صادر کر رہے تھے۔ دن بھر لڑائی ہوئی مسلمانوں کا نقصان زیادہ ہوا، یہاں تک کہ سورج نے غروب ہو کر چند گھنٹوں کے واسطے لڑائی کا پردہ ڈال دیا۔

ادھر دوسرے روز کا آفتاب نکلا ادھر دونوں فوجیں میدان جنگ میں آموجود ہوئیں۔ کھڑکی میں بیٹھے اپنی فوج کو لڑا رہے تھے اُن کے برابر آپ کی بیوی سلمیٰ بھی بیٹھی ہوئی تھیں اور جوں جوں مسلمان پیچھے ہٹتے

سے تھے اُن بچاری کا خون خشک ہوا چلا جاتا تھا۔ اُس وقت ایک شخص ابو محجن جو ایک مشہور بہادر تھا لڑائی کی کیفیت دیکھ رہا تھا آخر کار اُس سے ضبط نہ ہوسکا اور سلمیٰ کے پاس آکر کہا خدا کے واسطے اِس وقت مجھے چھوڑ دو۔ زندہ رہا تو خود آکر بیڑیاں پہن لوں گا۔ سلمیٰ نے انکار کر دیا مگر ابو محجن کے اسلامی جوش میں فرق نہ آیا۔ بالآخر سلمیٰ نے آکر ابو محجن کی بیڑیاں کاٹ دیں۔ جس وقت یہ بہادر میدان میں پہونچا ہے تو صفوں کی صفیں اُلٹ دیں۔ منہ پر نقاب پڑی ہوئی تھی۔ سعدؓ اور تمام فوج دنگ تھی کہ یہ کون بہادر ہے۔ جب ابو محجن کی شجاعت سے یہ لڑائی فتح ہوئی دشمن بھاگ گیا تو ابو محجن نے قیدخانہ میں آکر اپنے ہاتھ سے بیڑیاں پہن لیں۔

اُس وقت سعدؓ کی بیوی سلمیٰ نے کہا "وہ شخص جس نے آج مسلمانوں کی عزت رکھ لی ابو محجن تھا جس نے اپنے وعدہ کے موافق خود آکر بیڑیاں پہن لیں"۔ سعدؓ ابو محجن کی اس ایمان داری کو دیکھ کر دنگ رہ گئے اور کہا "خدا کی قسم مجھ کو حق نہیں ہے کہ میں ابو محجن جیسے شخص کو قید کر دوں"۔

ابو محجن چونکہ شراب کے جرم میں قید تھے اُنھوں نے بھی اپنی محسنہ سلمیٰ سے جس نے اِن کے ایمان پر بھروسہ کیا تھا وعدہ کیا کہ آج کے بعد شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

عصمت ۱۶ء

علی برادران

پانچ سال کی نظربندی کے بعد چھندواڑہ جیل سے رہا ہوکر ۹ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء کو جب رئیس الاحرار حضرت مولانا محمد علی اور اُن کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی صاحب دہلی تشریف لاتے تھے تو اُن کا وہ تاریخی جلوس نکالا گیا تھا جسکی سج دھج اور تزک و احتشام نے بادشاہوں کے جلوس بھلا دیے تھے۔ گھنٹہ گھر پر دونوں بھائیوں کا استقبال کیا گیا تھا۔ اور اُن کی خدمت میں مختلف جماعتوں کی طرف سے اشرفیوں کے ہار پیش کیے گئے تھے۔ اس موقع پر دو ایڈریس بھی دیے گئے تھے۔ دوسرا ایڈریس جو درج ذیل ہے خواتین دہلی کی طرف سے حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ نے تحریر فرمایا تھا۔ ملاحظہ ہو

مولانا محمد علی و شوکت علی صاحبان!

وہ ہوا جس نے سرزمین مصر پر اُس بڈھے باپ سے جو اپنے لال کی جدائی میں روتے روتے آنکھیں کھو چکا تھا یہ الفاظ کہلوائے "انی لاجد ریح یوسف" آج صدیوں بعد ہندوستان میں دوبارہ چل کر ہاسے بچھڑے ہوئے عزیزوں شوکت علی و محمد علی کی خوشبو دماغوں میں لا رہی ہے اور وہ آسمان جس نے مایوس و ناکام پیغمبر یعقوب علیہ السلام کے سینے سے کلیجہ کے ٹکڑے یوسف کو لپٹا ہوا دیکھا آج یہ منظر بھی دیکھ رہا ہے کہ مادر گیتی کے دونوں سپوت جن کے فراق میں ہماری آنکھیں خون رو رہی تھیں اس وقت ہماری نگاہوں کے روبرو ہیں ہمارے دل جوشِ مسرت سے لبریز، ہماری آنکھیں نشۂ فرحت میں مست اور ہمارے دماغ اطمینان و کامیابی میں ڈوبے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے اس لازوال طاقت کے روبرو سر جھکا کر سجدۂ شکر بجا لائیں جس نے

اپنی قدرت سے زلیخا کو یوسفؑ تک اور یوسفؑ کو یعقوبؑ تک اور شوکت علی محمد علی کو ہم تک پہنچایا۔

بچو۔ بھائیو۔ بزرگو، تم نے اپنے صبر و شکر، متانت و استقلال اور اعمال و افعال سے اسلام کا دورِ گزشتہ ہمیں آنکھوں سے دکھایا اور بتا دیا کہ ابھی دنیا میں کلمۂ توحید کے پڑھنے والے زندہ ہیں، مسلم یونیورسٹی اگر مسلمانوں کو کبھی نصیب ہوئی تو تمہاری مخلصانہ کوششیں جب تک اسلام ہندوستان میں باقی رہیگا اُسکے دل پر ثبت رہینگی۔ تم نے جس خلوص و راستی کے ساتھ اس سلسلے میں خدمات انجام دیں مسلمان اسکو ہرگز فراموش نہیں کر سکتے۔

اخبار کامریڈ و ہمدرد کا اجراء اور اُن کے ذریعہ سے قومی خدمات ہمارے دلوں پر نقش ہیں۔ قوم و وطن کے واسطے سربکف ہونا، ممالکِ اسلامیہ کی حمایت میں جان و مال کی قربانیاں وہ واقعات ہیں جنہوں نے ہم کو قرنِ اولیٰ کی تصویریں دوبارہ دکھا دیں اور بتا دیا کہ کس طرح مسلمانوں نے اپنے سینے دشمنوں کے تیروں کی نذر صرف اس لئے کئے کہ خدا کے رسولؐ پہ آنچ نہ آوے۔ تم نے جس خلوص بے جگری اور محبت سے ملک میں آزادی کی روح پھونکی اور خود فنا ہو کر ہم کو زندہ کیا اُس کا شکریہ ہماری زبان اور قلم دونوں سے باہر ہے۔

جنگِ بلقان میں جب خاکِ حجاب سے اُٹھنے والے پیغمبر کے کلمہ گو بیدردی کا شکار ہو رہے تھے، فاقوں نے اُنکی جان پہ بنا دی تھی، اور ہم خوابِ غفلت میں پڑے سو رہے تھے، تم نے ہم کو جھنجھوڑا۔ مظلوموں کی گریہ و زاری ہمارے کانوں تک پہنچائی۔ بیکسوں کی حمایت میں تمہاری صدا نے بلند ہو کر ہمارے دل ہلا دئے، اُن زخمیوں اور مریضوں کے واسطے جن کے سر پہ خدا کے سوا کوئی وارث نہ تھا وفد روانہ کیا۔

عزیزو۔ یہ وہ خدمات ہیں جن پہ ہم کیا ہماری نسلیں تک تمہاری قابلِ فخر ہستیوں پہ ناز کرینگی۔ انجمن خدامِ کعبہ کی بنا حجاج و زائرین کے لئے جو کعبۃ اللہ اور روضۂ اقدس کے شیدائی بنے، جو خدمات شوکت علی صاحب نے انجام دیں اور کلمۂ حق کے پڑھنے والے اطمینان و آسائش سے منزلِ مقصود پہ پہنچے اس کا اجر خدا کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

اس قیامت خیز جنگِ یورپ میں جس نے آسمان و زمین تک تھرا دئے جب حکومت کے سامنے فتح کے سوا کوئی دوسری چیز نہ تھی، قوانین جبریہ کے مقابلہ میں اپنی جانیں قربان کرائیں، اپنی آزادی کھوئی، حق کی حمایت میں نظربند ہوئے، ہمدرد جیسا عزیز پرچہ ملک و قوم پر قربان کیا، مہر ولی میں رکھے گئے، مگر تمہارے قدم نہ ڈگمگاتے تھے، تمہاری تیوریوں پہ بل نہ آیا، حکومت کا کوئی جبر و تشدد کوئی کوشش کوئی تدبیر تمہاری صداقت کو متزلزل نہ کر سکی۔

مبارک ہے وہ ماں جس کے پیٹ سے ایسے اچھے بچے پیدا ہوئے، اور قابل مبارکباد ہے وہ ملک جس کی سرزمین سے ایسے فرزندان اٹھے۔ لینسڈ ڈون کا قیام، خط و کتابت کی بندش، تنہائی، ابتلا، وہ جگر خراش واقعات تھے جن کو سُن سُن کر ہمارے کلیجے دہلے، اور اس کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے کہ ہر وقت دست بدعا ہے کہ معبود حقیقی تمہارے ارادوں میں استقامت اور تمہاری کوششوں میں برکت دے۔

الحمد للہ علیٰ احسانہٖ صداقت کے راستہ میں تم نے کانٹوں کو پھول، مصیبت کو راحت اور اذیت کو نعمت سمجھا، اور آج وہ وقت ہے کہ تمہارے جسم کا ہر رونگٹا ہندوستان کو صبر اور شکر کے معنی بتا رہا ہے۔

مصائب کی دوسری کروٹ وہ تھی جب وقت نے ان ہی مظالم پر بس نہ کی، اور تم کو چھنڈواڑہ کے ریت میں پہنچایا۔ یہ قیام مصیبت تھا۔ وہ پہاڑ تھا جو بڑے بڑے پہلوانوں کے چھکے چھڑا دیتا، مگر مرحبا مرحبا، آفریں صد آفریں۔ اسلام کے مقدس نمونوں کی گرد و غبار کے پرخار تودہ کو گلزار سمجھ کر تم نے سنت ابراہیمؑ ادا کی، اور ہر قدم دگنے جوش و خروش سے آگے بڑھایا، اور تم وہاں وہ یادگار چھوڑ کر آئے جو ہماری عصبیت کو ہمیشہ زندہ رکھیگی۔ چھنڈواڑہ کی خاک کا ہر ذرہ تمہارے خلوص کا شاہد ہے اور تمہاری بدولت آج صدائے حق پانچ مرتبہ اس ہوا میں گونجتی ہے۔

ہمارے خودغرض دل بھول جائیں، ہماری مسرور طبیعتیں وہ وقت یاد نہ رکھیں مگر تاریخ اسلامی کے اوراق اس جرأت، ہمت، دلیری کو نہیں بھول سکتے جب تم نے مشروط آزادی سے انکار کیا اور حکومت کو مسلمانوں کی اصلی شان دکھادی۔

اس سے پہلے کہ ہم اپنی ناچیز عرضداشت کو ختم کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ پھر اس جامع المتفرقین کا شکر ادا کریں جس نے ہم کو یہ خوشی کی گھڑی دکھائی اور بچھڑی ہوئی صورتیں پھر دوبارہ دکھادیں۔

بھائیو! ہماری بہت سی توقعات تمہاری ذات سے وابستہ ہیں، اس وقت جب کہ ہر طرف سے ممالک اسلامیہ کی عصبیت کی صدائیں ہمارے کانوں میں آرہی ہیں، اپنے قدم آگے بڑھاؤ اور اپنی کامیاب ہمتوں سے ان جگر دوز آوازوں کو فرحت و مسرت سے بدل دو۔ ہماری دلی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں اور ہم نہایت خلوص کے ساتھ خدائے برحق سے ملتجی ہیں کہ تمہاری عمر میں برکت دے اور تمہاری بزرگ ماں کا کلیجہ اور تمہاری آنکھیں ٹھنڈی رہیں، آمین۔ ثم آمین۔"

بیگم صاحب حسرت موہانی

کچھ مرد اور عورت ہی کی تخصیص نہیں، مسلمان جس وقت مسلمان تھے اور صبغۃ اللہ میں بھرپور۔ اُس وقت نہ صرف اُن کا قول اور فعل بلکہ ہر قدم جو پڑتا تھا اور بڑھتا تھا۔ اور ہر سانس جو آتا تھا اور جاتا تھا دائرۂ اسلام اور حدودِ رسالت کے اندر۔ یہ وہ وقت تھا کہ بڈھوں کا بڑھاپا، جوانوں کی جوانی، اور بچوں کا بچپن بجائے خود اسلام کا مفصل وعظ تھا۔ ہمارا وہ دورِ اولین دُنیا دیکھ چکی اور جہان سن چکا۔ کہ اسّی برس کے بڈھے کی سٹھیائی ہوئی اور پانچ برس کے بچے کی تتلائی ہوئی باتیں کسی رنگ اور کسی ڈھنگ میں، کسی کیفیت میں اور کسی حال میں اُصولِ اسلام سے علیحدہ نہ ہوتیں۔ زمانہ کیسی ہی ترقی کرے، اور وقت کہیں سے کہیں پہنچ جائے مگر اسی صفحۂ زمین پر جو مناظر ہم نے دکھادئے ہیں دُنیا اُن کو فراموش نہیں کر سکتی، مسلمانوں کو یاد نہ ہو، وہ نہ سُنیں، مگر اس ہوا میں اس بڑھیا کے الفاظ بھی گونج رہے ہیں۔ جسکی آنکھیں میدانِ جنگ میں کلیجہ کے ٹکڑے کو بے گور و کفن مردہ، سرپرست کو بے حس و حرکت جاں بلب، ماجائے بھائی کو بے یار و مددگار شہید دیکھتی ہے! کلیجہ لرز جاتا ہے، دل ٹکڑے ہوتا ہے، سر جھکا جاتا ہے، مگر زبان ایک حرف بھی تلقینِ اسلام کے خلاف نہیں کہتی، اور مامتا کو دبا کر الفت و محبت کو بھول کر دل اس ہستی کا جویا اور آنکھیں اس صورت کی متلاشی ہیں، زبان جس کا کلمہ پڑھتی ہے، چاروں طرف دیکھتی بھالتی پوچھتی پچھاتی جب یہ سُنتی ہے کہ خاتم النبیین زندہ ہیں تو آسمان کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔

"اگر یہ سچ ہے تو بیٹا بھائی اور شوہر تینوں اس پر تصدق" جب زمانہ ہمارے مٹانے پر کمربستہ ہوا تو پہلی ضرورت ہمارے جوہروں کو سلب کرنا تھا۔ ہماری بھلائیاں برائیوں سے، ہماری نیکیاں بدیوں سے، ہماری صداقت کذب سے اور ہماری روشنی تاریکی سے بدل گئی۔ مگر بھلائیاں گہری، نیکیاں مستقل، صداقت وزنی اور روشنی اس قدر تیز تھی کہ اب بھی اس کا اثر، اس کا پرتو، اس کا جزو، اس کا ذرہ کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں اپنا رنگ دکھا جاتا ہے۔

ہماری عزیز بہن محترمہ بیگم حسرت موہانی کی زندگی نے اپنی ہمت سے، اپنی جرأت سے، اپنے استقلال سے، اور اپنی صداقت سے، سرزمین ہندوستان کو دکھا دیا کہ مسلمانوں کے دور اولین میں کیسے کیسے خوش رنگ پھول عورت کی ہیئت میں مہکے ہوں گے۔ عزیزم مولانا حسرت نے اپنے ہنگامہ مصیبت میں جس استقلال کا ثبوت دیا ہے اُس کا سہرا بیگم حسرت کے سر ہے، اور یہ فخر ان ہی کو حاصل ہے کہ سخت سے سخت موقعوں اور نازک سے نازک لمحوں میں بھی اس مایہ ناز خاتون نے اپنے شوہر کا قدم نہ ڈگمگانے دیا۔

ارباب بصیرت انصاف کی آنکھوں سے دیکھیں اور بتائیں کہ بیگم حسرت کی ہستی مسلمانوں کی بساط حیات پر کیا پایہ رکھتی ہے۔

وقت کا بآواز بلند مطالبہ ہے کہ حسرت اپنے سات کروڑ بھائیوں کی طرح حکومت کے روبرو سر تسلیم خم کر دے، حسرت کا ایمان بہ بانگ دہل جواب دیتا ہے کہ حکومت کی طاقت سر آنکھوں پر مگر مادر وطن کے حقوق فراموش نہ ہوں گے۔ دوست آشنا ترغیب دیتے ہیں، عزیز اقارب تلقین کرتے ہیں، قوم سمجھاتی ہے، ملک کہتا ہے کہ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ چیونٹی کا مقابلہ ہاتھی سے۔ پستو کا شیر سے۔ دھاگے کا رسے سے، صریح غلطی اور کھلی نادانی ہے۔ مگر حسرت

کے کان نہیں سنتے، حسرت کا ایمان جواب دیتا ہے، حسرت کی زبان کہتی ہے کہ صداقت کی مصیبت راحت اور خلوص کی کلفت عشرت ہے۔ حسرت کی فنا ہونے والی ہستی جیل خانہ پہنچی ہے، اور خاک ہونے والا جسم ہتکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑا ہوا ہے ٹاٹ کے کپڑے اور گاڑھے کا کنٹوپ اوڑھ رکھا ہے۔ عزیز اس سے بھاگتے ہیں، قوم اس سے نفرت کرتی ہے، ایسی حالت میں حسرت دلہن جیل خانہ جاتی ہے اور یہ منظر دیکھ کر کہتی ہے کہ حسرت پھولوں کے سہرے اور ریشمی کپڑوں میں صرف میرا دولہا تھا اور آج ملک کا دولہا ہے! جو کی روٹی کو پلاؤ کی رکابی سے، نیلے دوپٹے کو جھومر جھلنیوں سے بہتر سمجھوں گی اور اس قید پر فخر کروں گی۔"

جیل خانہ نے حسرت کو اذیت دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، اور بیگم اپنی تحریر سے اپنی تقریر سے شوہر کا دل بڑھاتی ہو، سودیشی دکان کا انتظام ہاتھ میں لے کر حسرت کا جوش وطن تازہ رکھتی ہو، اور اسی آمدنی سے اپنی ضرورتیں پوری کرتی ہے، افلاس شیطان کی طرح چاروں طرف سے اپنی خوفناک صورتیں دکھاتا ہے، مگر یہ عفت کی پکی اور ارادے کی سچی لاحول پڑھ کر منہ پھیر لیتی ہے، اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتی ہے، اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی ہے اور ثابت قدمی اور استقلال کا وہ نمونہ دکھاتی ہے کہ دنیا دنگ رہ جاتی ہے!

بدنصیب باپ ہفت سالہ معصوم بچی کو قید کے وقت ماں کے پاس چھوڑ جاتا ہو اور اچھی ماں خود ہی مدرسہ اور خود ہی استانی بنکر اس لڑکی کو اس قابل بنا دیتی ہو کہ یہ کہنا حق ہوگا کہ خوش نصیب ہوگا وہ گھر جس کی ملکہ حسرت کی بچی ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ملک ہندوستان کے ہر ذرے نے شوہر پرستی کا ثبوت دیا ہو اس سے ہم کو بھی انکار نہیں۔ مگر اس کو کسی خاص قوم یا فرقہ سے متعلق کر دینا بحث کا حق رکھتا ہے، اور مسلمانوں کی آئندہ نسلیں یہ کہہ سکیں گی کہ ایک دفعہ کی موت سے

ہر لمحہ کی حالت نزع زیادہ کٹھن ہے، جس کو محترمہ بیگم حسرت نے خوشی سے گوارا اور بہ طیب خاطر قبول کیا، اسلام دین فطرت ہے، اس نے عورت کو شوہر پرستی کے ساتھ ہی غیرت اور خودداری کی جو ہدایت کی اُس کا ثبوت بیگم حسرت کی زندگی میں موجود ہے۔

ایک دو نہیں کئی ہاتھوں نے یہ خواہش کی کہ روپیہ کی نچھاور سے بیگم کی تکالیف کم کریں، لیکن یہ سیدانی جس کے نانا نے پیٹ سے پتھر باندھ کر تخت شاہی پر لات مار دی متوجہ نہ ہوئی، اور ہر درخواست شکریہ کے ساتھ واپس دی۔ دولت کے بندے اور ایمان کے اندھے اگر افلاس کو کسرشان نہ سمجھیں تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فاقوں میں رہ کر، دکھ اُٹھا کر اور مصیبت بھگت کر عزت و شرافت کو قائم رکھنا، اور خودداری کو ہاتھ سے نہ دینا سیدانی اور صرف سیدانی کا کام تھا۔

جس جرأت جس ہمت اور جس صداقت سے محترمہ بیگم حسرت نے وزیر ہند سے گفتگو کی ہے اُسکی داد دینی آسان نہیں، تعارف پر فخر کرنیوالے اور ملاقات کو مایۂ ناز سمجھنے والے لوگ اپنی دُھن میں مست اور خیال میں مگن سمجھا ہے ہیں کہ حرف مطلب زبان پہ نہ لائے مگر سامنے جاتے ہی سیدانی کا جوش دوبالا ہو جاتا ہے، ساتھ والے روکتے ہیں، زبان پکڑتے ہیں، مگر صداقت کی پتلی پہلی بات یہ کہتی ہے "پولیٹکل قیدیوں کو مسلمان نظر بندوں کو سن فین کے مانند رہا کیجئے"۔ مبارک ہو وہ شوہر جس کی بیوی خوش نصیب ہے وہ بچی جس کی ماں اور قابل فخر ہے وہ عورت جس کا سر صاحب وزیر ہند کے سامنے اس صداقت سے اُٹھ کر اظہار حقیقت کر گیا۔ اور خدائے واحد کے حضور میں نیچگانہ عاجزی سے جھک کر کہتا ہے "اگر ہماری نیتیں درست اور ہماری کوششیں صحیح ہیں تو ارادوں میں تقویت اور ہمت میں برکت دے۔

نظر بند نمبر خطیب ۱۸ء

مصورِ غم

مصورِ غم حضرت علامہ راشد الخیری (خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے) شاہجہاں آباد کے اُس مقتدر اور ممتاز خاندان کے فرزند رشید تھے جسے خاندان شاہان مغلیہ کے اُستاد ہونیکا نسلاً بعد نسلاً فخر حاصل رہا جس نے مولوی عبد الخالق صاحب مرحوم مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحر البیان مولوی عبد الرب مغفور بانی جامع مسجد سہارنپور جیسے جید علماء اور قرآن وحدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے - یہ اجڑے دیار کا وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظ حاجیہ قاریہ ام عطیہ النساء مرحومہ (چھوٹی استانی جی) اور حاجیہ ام زکیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے داماد شمس العلما مولوی نذیر احمد مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے - حضرت علامہ مغفور بمقام دہلی جنوری ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے - اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ ان کے والد ماجد مولوی حافظ عبد الواحد صاحب نے حیدرآباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسر اعلیٰ تھے، انتقال فرمایا، اور حضرت علامہ مرحوم کی تعلیم وتربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبد القادر صاحب مرحوم اور خان بہادر مولوی عبد الحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی -

یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے - اس لئے حضرت علامہ مغفور نے اُردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی - پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی - مگر انہوں نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی - مولوی نذیر احمد مرحوم (جو علامہ مرحوم کے حقیقی پھوپھا تھے) اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی ترقی میں چار چاند لگا دئے - ابھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ ان کی ذہانت کا چرچا ہونے لگا -

تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبد الرحیم صاحب بانی جامع مسجد جھجر کی اکلوتی صاحبزادی سے جنوری ۱۸۹۰ء میں شادی ہوئی - اور ۹۱ء میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت شروع کی - مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی - اور دفتر کے خشک کاموں میں جی نہ لگتا تھا - پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز کے لئے گوارا نہ کر سکتی تھیں - ان وجوہ سے جم کر ایک جگہ نوکری نہ کی - اور ترقی کے نہایت معقول مواقع میسر آنے پر ان کی طرف مطلق توجہ نہ فرمائی، اور سانا، مین پوری، میرٹھ، علی گڑھ، دہرہ دون

کی تبدیلی ہوتی رہی آخر دلی کے پوسٹل آڈٹ آفس میں تبدیل ہوئے مگر چند سال گذرے تھے کہ ۱۹۱۰ء میں اٹھارہ انیس سال کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔

حضرت علامہ راشد الخیری رحمۃ اللہ علیہ کی سب سے پہلی تصنیف "حیات صالحہ" یا "صالحات" ہے جو ۱۸۹۵ء میں لکھی گئی ۱۸۹۸ء میں دوسری تصنیف "منازل السائرہ" ختم کی۔ ان دونوں اصلاحی ناولوں کی اشاعت کے بعد حضرت علامہ مغفور کا شہرہ ایک مقبول پایہ مصنف کی حیثیت سے بلند ہونا شروع ہوا۔ ۱۹۰۳ء سے رسالہ "مخزن" میں افسانے اور مضامین شائع ہونے لگے۔ پھر "صبح زندگی" شائع ہوئی اور دلی کے باکمال ادیب کی طرز تحریر کی دلآویزی، زبان کی شیرینی، اور واقعات کے پیرایہ بیان کی دردانگیزی کی دھوم مچنے لگی۔ ۱۹۰۸ء میں رسالہ "عصمت" جاری کیا جو ۲۸ سال سے برابر شائع ہو رہا ہے اور ہندوستان کا بہترین زنانہ پرچہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۱ء میں حقوق نسواں کی حمایت میں رسالہ "تمدن" جاری کیا جو ۵ سال تک بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ۱۹۱۵ء میں اخبار "سہیلی" جاری فرمایا مگر ۱۹۱۶ء میں دفتر عصمت میں قیامت کی آگ لگی اور سہیلی جاری نہ رہ سکا۔ ۱۹۱۷ء میں "شام زندگی" شائع ہوئی اور اسے وہ مقبولیت حاصل ہوئی کہ پہلے ہی سال میں تین مرتبہ چھپی اس کتاب نے قوم سے حضرت علامہ مغفور کو مصور غم کا خطاب دلوایا۔ اب اُردو کے بےمثل مصنف نے تصانیف کا ڈھیر لگا دیا اور دو درجن کے قریب ضخیم کتابیں ۱۹۱۷ء سے ۱۹۲۳ء تک کے زمانہ میں لکھ ڈالیں جو مختلف حضرات نے شائع کیں۔ اور بقول ایک ادیب "لاکھوں روپیہ پیدا کیا"۔ حضرت مصور غم نے اپنی تصانیف کی جو مقبولیت دیکھی شاید اُردو کے کسی مصنف کو دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔ ایک دو نہیں درجنوں کتابیں آٹھ آٹھ دس دس سال کے عرصہ میں دس دس بارہ بارہ دفعہ چھپیں۔ بلکہ "صبح زندگی" "شام زندگی" وغیرہ کے تو پندرہ پندرہ بیس بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری دو کتابیں "آمنہ کا لال" "سیدہ کا لال" بھی چار ساڑھے چار سال میں ہزاروں کی تعداد میں پانچ دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ نکل گئیں۔

۱۹۱۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اُردو کورس علامہ مغفور سے صحیح کرائے ۱۹۲۰ء میں نیشنل یونیورسٹی نے سب سے پہلا اُردو ممتحن مقرر کیا۔ ۱۹۲۶ء میں حکومت بہار داڑیسہ نے شمالی ہند سے بہ حیثیت ماہر اُردو کے اُردو ہندی کی ترقی کے سلسلے میں حضرت مرحوم سے بیش بہا مشورے لئے۔

۱۹۲۲ء میں مسلمان بچیوں کے لئے تربیت گاہ بنات قائم کی جس سے ہندوستان کے مختلف حصوں کی سینکڑوں خوشحال اور یتیم و نادار بچیوں نے بہ حیثیت بورڈر تعلیم و تربیت حاصل کی۔ اور جس سے ہزاروں غریب کم استطاعت بچیاں زیور تعلیم سے آراستہ ہوئیں

اس مدرسہ کے لئے بیگم صاحبہ محترمہ کے ساتھ علامہ مغفور باوجود پیرانہ سالی کے ہندوستان کے کسی صوبہ کا سال میں مہینہ سوا مہینہ کا دورہ فرماتے تھے۔ مدرسہ کے کاموں میں محترمہ بیگم راشد الخیری صاحبہ حضرت علامہ مرحوم کی برابر کی شریک رہیں۔ سنہ ۲۷ء میں مسلمان بچیوں کے لئے رسالہ "بنات" جاری فرمایا۔ سنہ ۲۴ء میں علامہ مغفور کی مرحومہ بہو محترمہ خاتون اکرم کی یادگار میں زنانہ دستکاری کا رسالہ "جوہر نسواں" جاری ہوا۔ حضرت علامہ راشد الخیری کی (خدا انہیں غریق رحمت فرمائے) خودداری بڑے آدمیوں اور بااثر و بارسوخ لوگوں سے ملنے جلنے کو کبھی درست نہ سمجھتی تھی۔ نام و نمود شہرت و خودستائی جلسوں اور بے نتیجہ تقریروں سے سخت نفرت تھی۔ کسی جلسہ یا کسی تحریک میں حصّہ نہ لیتے تھے۔ حضرت مصور غم نے خاموشی کے ساتھ مسلسل چالیس سال تک تصانیف اور رسالوں کے ذریعہ خواتین ہند اور ادب اُردو کی جو زبردست شاندار خدمات انجام دیں وہ اس قدر گراں بہا اور عظیم الشان ہیں کہ مشہور ادیبوں اور رہنمایان قوم کا فیصلہ ہے کہ ان کی نظیر نہیں نکل سکتی۔ اصلاح نسواں اور حقوق نسواں کے لئے حضرت علامہ راشد الخیری علیہ الرحمۃ کی کوششیں کبھی فراموش نہ ہوسکیں گی۔ مصور غم ہی کی تحریروں سے عورتوں کی مظلومیت پر مردوں کے دل پسیجے۔ مصور غم ہی کے لٹریچر سے عورتوں کو اپنی اصلاح و ترقی کا احساس پیدا ہوگیا۔ اور گذشتہ نہائی صدی میں خواتین ہند میں جو تھوڑی بہت بیداری پیدا ہوئی ہے متفقہ طور پر اس کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس میں بہت بڑا حصہ جنت نصیب حضرت علامہ راشد الخیری کی ان تھک مسلسل کوششوں کا نتیجہ ہے۔ حضرت مصور غم علیہ الرحمۃ مشرق کے بے مثل حزن نگار مصنف ہی نہ تھے مزاحیہ مضامین لکھنے میں بھی کمال رکھتے تھے۔ ناولسٹ بھی تھے، جرنلسٹ بھی، مختصر افسانہ نگار بھی تھے، شاعر بھی تھے، اور انشاپرداز بھی، مگر ہر حیثیت میں مصلح اور نسوانی جذبات کے ترجمان۔ ان کی تحریر کی طرح ان کی تقریروں اور لکچروں میں بھی خدا نے کچھ ایسا اثر اور آواز میں کچھ ایسا درد عطا فرمایا تھا کہ مجمع زار و قطار آنسو بہاتا تھا۔ حضرت علامہ مغفور میں مذہبی عنصر بہت غالب تھا۔ زمانۂ شباب میں علاوہ مذہب کے فارسی شاعروں اور انگریزی مصنفین کا بھی مطالعہ فرمایا تھا، حافظہ حیرت انگیز تھا۔ موسیقی سے بہت دلچسپی تھی انگریزی اور ہندوستانی بہت سے کھیل جانتے تھے۔ بدن کسرتی تھا، جسم دوہرا قد لمبا، چہرہ پر دلالت اور نور برستا تھا خانگی زندگی انتہائی کامیاب تھی۔ اور دیکھنے والوں کے لئے ہر حیثیت سے قابل رشک تھی۔ بے نظیر بیٹے، لاجواب بھائی، سعادتمند داماد، بے مثل شوہر، عاشق زار باپ، اور بہترین دوست ہمیشہ شاداں و خنداں رہتے تھے۔ ان کی بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور زندہ دلی ان کے ملنے والے

بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتے۔ جن کی قابلیت کا چار کھونٹ ڈنکا بج رہا تھا۔ جن کی شہرت اس دور کے بڑے بڑے مصنفوں اور رہنماؤں کے لئے باعث رشک تھی، جن کا نام عزت کے ساتھ جنکا ذکر محبت کے ساتھ لیا جاتا، اور کیا جاتا تھا۔ ان کی شرافت اور اخلاق سادگی اور وضعداری، مہمان نوازی اور انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈالدیتی تھی۔ ان کی عاجزی اور انکساری کا یہی ثبوت کچھ معمولی نہیں کہ ۸۰ کے قریب کتابیں زندگی میں شائع ہوگئیں۔ لیکن کسی کتاب میں تصویر شائع نہ کرنے دی۔ کسی کتاب کو کسی کے نام منسوب نہ کیا۔ کسی کتاب میں کسی کی تقریظ جائز نہ سمجھی۔ تین چار کتابوں میں دیباچے بھی مجبوراً لکھے۔ ورنہ سوائے ٹائیٹل پر نام آنے کے اپنا نام تک اپنی کتاب میں دوبارہ آنا پسند نہ فرمایا۔ صبر و شکر توکل و قناعت ہمیشہ شیوہ رہا۔ اپنی حالت میں بے انتہا خوش رہے۔ رحمدلی مخلصانہ عملی ہمدردی، غیروں کی آگ میں کود پڑنا۔ دوسروں کے لئے سب کچھ لٹا دینا المختصر خدمت خلق اللہ حاصل عمر تھا۔ ۶۸ سال کی عمر تھی اور بظاہر صحت نہایت اچھی کہ دو ماہ بیمار رہ کر ۳ فروری ۳۶ء کی منحوس صبح کو اجڑے دیار کے آخری باکمال مصنف کا سایہ قوم بدبخت کے سر سے اٹھ گیا۔ مصور غم کی رحلت پر ہندوستان بھر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں کہرام مچ گیا جگہ جگہ زنانہ اور مردانہ ماتمی جلسے ہوئے اور ہندوستان کے باہر ادب اردو کا ذوق رکھنے والا ہر شخص دم بخود ہو گیا۔ جس قدر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے مضامین جتنے مرثئے نوحے قطعات تاریخ المختصر جس قدر بلند پایہ ماتمی لٹریچر مصور غم کے انتقال پر شائع ہو گیا وہ اتنا زبردست ہے کہ بقول اڈیٹر تمت "کسی ادیب یا رہنما کی وفات پر اس وقت تک شائع نہ ہو سکا" آسمان کتنی ہی کروٹیں بدلے، زمین کتنے ہی چکر کاٹے، ہندوستان بدلے ہندوستان والے بدلیں، معاشرت بدلے ادب بدلے لیکن مصور غم حضرت علامہ راشد الخیری کو ہمیشہ عزت و محبت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ اور ان کا نام آنے والی نسلیں فخر کیساتھ لیتی رہیں گی۔ خدا کی بیشمار رحمتوں کے پھول اس مزار مبارک پر برستے رہیں جس میں وہ میٹھی نیند سو رہے ہیں، اور خدا جنت نعیم میں اس پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے۔ جس کی دائمی مفارقت میں آٹھ آٹھ آنسو رلا رہی ہے۔

رازق الخیری

۲۲ جولائی ۳۶ء

فخرِ نسواں ہند محترمہ خاتونِ اکرم جنت مکانی کی یادگار میں

جوہرِ نسواں دہلی

زنانہ دستکاری کا ماہوار رسالہ ۱۹۳۴ء سے جاری ہے

دفتر عصمت دہلی کے اس ماہوار رسالہ میں کشیدہ۔ کروشیا۔ جالی۔ تارکشی۔ کارپٹ۔ کینوس۔ کراس اسٹیچ۔ سلمہ ستارہ۔ ربن پتی۔ کٹاؤ اور کپڑوں کی سلائی۔ کٹائی وغیرہ وغیرہ مختلف قسم کی زنانہ دستکاریوں کے عمدہ عمدہ نمونے اور مفصل ترکیبیں اور کارآمد ہدایتیں شائع ہوتی ہیں جوہر نسواں کے مضامین پھوہڑ لڑکیوں کو بھی سگھڑ اور ہنرمند بنا دیتے ہیں جوہر نسواں کی قلمی معاونین ہندوستان کی مشہور دستکار خواتین ہیں اور اڈیٹر مقبول و مشہور کتابوں کی مؤلفات۔ سال میں دو خاص نمبر شائع ہوتے ہیں جو کسی موضوع پر بہترین مستقل کتابیں ہوتی ہیں۔

ٹائیٹل نہایت خوبصورت کاغذ چکنا دبیز لکھائی چھپائی مصوری اعلیٰ درجہ کی۔

سالانہ چندہ۔ مع محصول دو روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ ۴؍

دفتر عصمت کی کچھ اور کتابیں

سوئی کا کام	عمہ	ادب زریں	۸؍	افسانہ حرم	۸؍	فیروزہ	۸؍
موتیوں کا کام	عاہ	نغمات موت	۶؍	آئینہ مولکہ	عمہ		
سلمہ ستارہ کا کام	عاہ	خانہ داری کے تجربات	۱۲؍	سنگھار خانہ	عاہ		
اونی کام سلائیوں سے	عہ	مفید نسواں	۸؍	تندرستی ہزار نعمت	۵؍		
خواتین کی دستکاریاں	۸؍	جاں باز	۱۲؍	زنانہ بستہ	عہ؍	شمع خاموش	۶؍
جاپانی کہانیاں	عہ؍	دامن باغباں	عہ؍	پردہ تعلیم	۱۲؍		
مزیدار کہانیاں	۵؍	روحانی شادی	۶؍	صنعت و حرفت	۱۲؍		
شہید وفا	۵	آئینہ جمال	۱۲؍	زچہ خانہ	۸ پیسہ		

(مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی)

Printed at Mahboob-ul-Matabai, Delhi.